جہد و عمل۔۔۔قومی بیداری کیلئے!!!
ماہنامہ
آزاد
سگار پبلی کیشنز

ستمبر 2014

شمارہ نمبر:26 جلد:2

فہرست

1 ایک سکے کے دو رخ۔۔۔اداریہ۔۔۔ 02

2 عالمی معاشی جنگ۔۔۔کریمہ بلوچ۔۔۔ 03

3 SFTاور تبت۔۔۔قائم خان بلوچ۔۔۔ 06

4 جو لوگ خود سے۔۔کمال بلوچ کا خطاب۔ 10

5 زاہد بلوچ جو بلوچ۔۔ڈاکٹر منان کا خطاب 12

6 وہ جو چھوٹی چھوٹی باتوں۔۔جوہر بلوچ۔۔۔ 14

7 بلوچ تحریک آزادی۔۔لکمیر بلوچ۔۔ 17

8 خاتمہ غلامی اور عالمی۔۔۔نودان بلوچ۔۔۔ 19

9 رحیم زرد کوہی۔۔۔واجہ محمد حسین بلوچ۔۔۔ 26

10 تنقید اور جمہوری۔۔۔عزت بلوچ۔۔۔ 27

11 غلبہ۔۔۔پاؤلو فریرے۔۔۔ 29

12 ماہانہ تجزیہ۔۔۔اداریہ۔۔۔ 30d

www.sagaar,net azadmagazine@gmai.com www.azadmagazine.wordpress.com

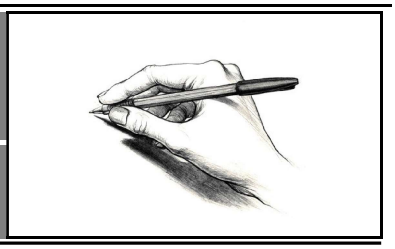

اداریہ

’’ایک سکے کے دورخ‘‘

قابض ملک پاکستان بلوچستان پر اپنے قبضے کو جواز اور دوام بخشنے کیلئے ہمیشہ سے ہی مذہب کا سہارا لیتا آیا ہے۔ 27 مارچ 1948 کو اسی مذہب کو جواز بنا کر ہی پاکستانی فوج بلوچستان پر قابض ہوا تھا حالانکہ پاکستان کے اسلام کو جواز بنا کر الحاق کے دعوت کو اس وقت بلوچستان کے دونوں ایوانوں نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اگر مذہب کے بنیاد پر ہمیں کہا جارہا ہے کہ ہم اپنا جداگانہ قومی شناخت قربان کر کے پاکستان میں ضم ہو جائیں تو پھر افغانستان اور ایران الگ الگ مسلم ممالک کیوں وجود رکھتے ہیں انہیں کیوں دعوت نہیں دی جاتی کہ وہ پاکستان کے ساتھ ضم ہو جائیں لیکن مذہب ایک جواز تھا جسے قابض استعمال کر کے اپنے نوآبادیاتی عزائم کی تکمیل چاہتا تھا، اسکے بعد جب آغا عبدالکریم خان نے بغاوت کی اور بغاوت کے بعد اسے مذاکرات کی دعوت دی گئی مذاکرات میں اس کے مطالبات تسلیم کر کے بیچ میں قرآن کو ضامن بنایا گیا لیکن جیسے ہی مذاکرات ختم ہوئے اور آغا عبدالکریم ہربوئی کے پہاڑوں سے مذاکرات کر کے اترے ہی تھے اسے گرفتار کر کے دس سالوں تک زندانوں میں بند کیا گیا، پھر بابو نوروز خان کو 1958 میں قرآن کا واسطہ دیکر پہاڑوں سے اتارنا پھر انکے فرزندوں کو سولی پر چڑھانا بھی تاریخ کے ان پرنوں کا تاقیامت حصہ ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ مذہب پاکستان کیلئے لوٹ کھسوٹ اور دھوکہ دہی سے زیادہ کی حیثیت حاصل نہیں کر سکا ہے۔ اسی اسلام کے مقدس نام کو استعمال کر کے ہندوستان سے الگ کر کے مسلمان سرمایہ داروں کیلئے ایک الگ ملک پاکستان بنایا گیا اور ایک فوج انکے مفادات کے حفاظت کیلئے تشکیل دی گئی اب اسلام کے اسی مقدس نام کو استعمال کر کے ایک طرف پاکستان سعودی عرب سمیت تمام عربوں سے پیسے بٹورتا ہے اور دہشتگردوں کو محفوظ پناہ گاہیں مہیا کرتا ہے تو دوسری طرف امریکہ سے پیسے لیکر انہیں ختم کرنے کا بھی دعویداری کر رہا ہے۔ یعنی یہی مذہبی عناصر اور نام نہاد مولوی اور جہادی ہمیشہ پاکستان کیلئے ایک روزگار اور کمانے کا ذریعہ اور ہر مسئلہ کا حل رہے ہیں۔

بلوچستان میں بلوچ قومی تحریک اپنے جائز اور سچ پر مبنی موقف کی وجہ سے بلوچ سماج میں انتہائی پذیرائی اور ہمنوائی حاصل کر چکی ہے، پاکستانی فوج کے مظالم کے باوجود قبضہ سے لیکر آج تک بلوچ قومی تحریک کی شدت میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے، موجودہ تحریک میں تمام تر ریاستی جبر کے باوجود عوام کا جھکاو تحریک کے طرف ہمدردانہ ہی رہا ہے۔ اب قابض ریاست اپنے آزمودہ مذہبی شدت پسند گروہوں کو یہاں بھی استعمال کرنے اور تحریک کو سبوتاژ کرنے کی سعی کر رہا ہے۔ اول لشکر جھنگوی وغیرہ کی صورت میں انہیں یہاں محفوظ پناہ گاہیں مہیا کر کے شیعہ و ہزارہ نسل کشی شروع کی گئی، پھر انہیں بلوچستان بھر خاص طور پر مستونگ، زہری اور پنجگور میں مکمل فری ہینڈ دے دیا گیا تاکہ وہ بلوچ سماج کے اندر رہ کر قومی تحریک کے خلاف کام کرنا شروع کریں۔ ان شدت پسندوں کے آبادکاری کے بعد اب قابض باقاعدہ طور پر انہیں تحریک کے خلاف استعمال کرنا شروع کر چکا ہے، قابض نے ان شدت پسندوں اور لٹیروں و جرائم پیشہ افراد پر مبنی ڈیتھ اسکواڈوں سے مربوط کر کے انہیں مذہب کے نام پر بلوچ سماج میں انتشار پھیلانے کا ٹاسک دے دیا ہے۔ قابض سامنے تو ان کو لانا چاہتا ہے لیکن خود مکمل طور پر انکے پیچھے چھپ کر انہیں مالی، عسکری اور تزویراتی حوالے سے معاونت فراہم کر رہا ہے تاکہ اسکا مکروہ چہرہ چھپا رہے، پنجگور میں سمیت مکران بھر میں تعلیمی اداروں میں بچیوں پر پابندی اور کوئٹہ و مستونگ میں خواتین پر تیزاب پاشی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں اب مکران میں ان گروہوں کو خاص طور پر متحرک کر کے قابض ذکری اور نمازی کا انتشار پھیلانا چاہتا ہے، حال ہی میں آواران میں ذکر خانے پر حملہ اسکی سب سے بڑی مثال ہے، اسکے پیچھے بھی قابض کی یہ سوچ کارفرما ہے کہ ان قوتوں کو سامنے لا کر خفیہ ادارے اور فوج پسِ پردہ بلوچ جہد کاروں اور ہمدردوں کو نشانہ بنائے اور عالمی طور پر یہ ظاہر کرے کہ اصل میں یہ شدت پسند گروہوں کی کارستانی ہے اور ساتھ ساتھ بلوچ قوم میں کے روشن خیال و اعتدال پسند اقدار پر حملہ کر کے یہاں تنگ نظری اور شدت پسندی کو فروغ دیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں پاکستانی فوج اور یہ مذہبی شدت پسندی گروہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ بلوچ قوم ان ریاستی حربوں کا ادراک رکھتے ہوئے کسی طور اشتعال میں نہیں آئیں اور ان عناصر کا قلع قمع کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

☆☆☆

عالمی معاشی جنگ، بلوچ جغرافیہ و سائل کی اہمیت اور بلوچ قومی تحریک پر اسکے اثرات

﴿بی ایس او آزاد کراچی زون کی جانب سے منعقدہ سیمینار میں سینیئر وائس چیئر پرسن کریمہ بلوچ کا پیش کیا گیا مقالہ﴾

معزز حاضرین مجلس!

دنیا کو طاقت کا توازن کھوئے دو دہائیوں سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے۔ ایک وقت تھا جب دنیا کی طاقت سوویت یونین اور امریکہ کی صورت میں دو واضح حصوں میں تقسیم تھی، جسے بائی پولر دنیا کہا جاتا تھا، اس تقسیم کی وجہ سے طاقت میں ایک توازن قائم تھا، اس بائی پولر دنیا نے کسی خاص طاقت کو دنیا پر اپنی اجارہ داریت قائم کرنے اور من مانہ نظام مسلط کرنے سے روکے رکھا تھا۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد ایک عرصہ تک یہی سمجھا جاتا رہا ہے اور اب بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دنیا کی طاقت اب امریکہ کے ہاتھ میں مرکوز ہے اور جس طرح کی دنیا، امریکہ وجود میں لانا چاہتا ہے، اسے روکنے والا کوئی نہیں، فری مارکیٹ کے بے لگام گھوڑے نے ملٹی نیشنل کمپنیوں کے توسط سے انسانوں کی طرح اقوام کے بیچ بھی بدترین معاشی ناہمواریوں کو جنم دیا، آج صرف امریکی دفاعی بجٹ دنیا کے درجنوں غریب ممالک کے مجموعی سالانہ بجٹ سے کئی گنا زیادہ ہو چکا ہے، صرف ملٹی نیشنل کمپنی کوکا کولا کا بجٹ اس وقت دنیا کے دس غریب ممالک کے بجٹ کے برابر آچکا ہے، یہ سب اس یونی پولر دنیا اور آزاد مارکیٹ کی دین ہیں۔

دنیا کو ''مادرِ ارضی'' کہنے والے آج بھی اس بات کو لے کر پریشان ہی ہیں کہ یہ ''اشرف المخلوقات'' جو انسان کی شکل میں موجود ہیں، ''تہذیب یافتگی'' کے نام پر کرّہ ارض پر تباہی کے سوا کچھ اور بھی کر پائے گا یا نہیں۔ یہ تمام تباہیاں محض زیادہ سے زیادہ وسائل بٹورنے کے ہی بہانے ہیں۔ دنیا میں جو لوگ جنگوں کے خلاف ہیں، وہ بھی تو جنگ کا ہی حصہ ہیں، کہیں سرگرم حصہ اور کہیں خاموش حصہ، ایک ایسے دنیا میں بھلا امن کا خواب کیسے شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے جہاں ظالم و مظلوم ایک ہی کمپنی سے اسلحہ خرید کر لڑ رہے ہوں، اس دنیا میں جنگ کو آخر کونسی طاقت روکے گی جب دنیا کے سب سے زیادہ طاقتور ملک کی ذرائع آمدنی کا دوسرا بڑا حصہ جنگی ساز وسامان کے بیچنے سے ہو۔

آج دنیا کے ان معاشی، معاشرتی، عسکری اور سماجی ناہمواریوں کو دیکھ کر اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ، دنیا ایک نئی تقسیم کا متقاضی ہے۔ یہاں سوال اٹھ سکتا ہے کہ اس تقسیم کے خدوخال کیا ہوسکتے ہیں میں یہاں پال ہنٹگٹن کے تہذیبوں کے تصادم کے نظریے سے پہلو تہی کرتے ہوئے یہ کہنے کی آزادی چاہوں گی کہ مستقبل میں اس تقسیم کے خدوخال اور نوعیت ہر جگہ مختلف ہوگی، اس تقسیم کی بنیادیں ہر خطے کے مخصوص تضادات پر منحصر ہونگے۔ جہاں یہ تضاد معاشی ناہمواری کی صورت میں ہے وہ مخصوصی طبقاتی جہتوں میں نمو پاتے ہوئے اپنا اظہار طبقاتی بنیادوں پر کریں گے اور جہاں جہاں یہ تضاد ''مذہبی فرقوں'' کا ہے، وہاں تقسیم کی بنیاد ''مذہبی فرقے'' ہوتے جائیں گے اور جہاں ''اہم تضاد'' قومی ہیں، وہاں پر تقسیم کی نوعیت کو جلد یا بدیر ''قومی'' بنیادوں پر ہی ہونا پڑے گا۔ اسلئے کہ تضاد ایک فطری شے ہے یہ کبھی مرتا نہیں ہے، آپ جتنی بھی طاقت وقوت سے دو متضاد چیزوں کو جوڑنے کی کوشش کریں یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ وہ اپنے باہم کبھی ربط پیدا نہیں کرسکتے اگر جو ربط پیدا کرسکے وہ تضاد ہی نہیں، دریا کے دو کناروں کے خشکی کو کبھی جوڑا نہیں جا سکتا اور اگر وہ جڑ جائیں تو پھر اسکا مطلب وہاں دریا ہی نہیں۔ ہاں تضاد کو عارضی طور پر دبایا جاسکتا ہے، کمزور کیا جاسکتا ہے، اس کو طاقت و قوت سے شاید موخر بھی کیا جاسکے لیکن تضاد کے وجود کو کبھی ختم نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس تقسیم کیلئے امر محال یہ ہے کہ یہ تضادات بناوٹی نہ ہوں بلکہ یہ اپنی جڑیں ماضی اور زمین میں پیوست پاتا ہو۔

عراق، شام یا دنیا کے کسی بھی حصے میں دیکھیں ہر جگہ یہ تضادات ابھر رہے ہیں، جہاں بھی غیر فطری رشتے استوار ہوئے ہیں وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ عراق میں شیعہ سُنّی کا تضاد ایک لمبے عرصے سے موجود تھا، اسی تضاد نے آخر ایک نہ ایک دن سر اُٹھانا ہی تھا۔ دوسری طرف عراق کے ہی اندر کُردوں کا قومی تضاد بھی وجود رکھتا تھا اور اس نے بھی کسی نہ کسی دن سر اُٹھانا ہی تھا۔

یہ بات کبھی بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے کہ قبضہ گیریت کی بنیاد ہمیشہ وسائل کے حصول کے تگ ودو میں محو توسیع پسندانہ عزائم ہی رہے ہیں۔ یہی حضرتِ انسان کی تمام جنگوں کی تاریخ ہے، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے ہولناکیوں پر ذرا غور کریں پھر ان کی وجہ تلاشیں تو پتہ چلتا ہے کہ سترھویں صدی سے شروع ہونے والے کالونیل دور میں جرمنی کے سوا تمام یورپی اقوام نے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کرتے ہوئے تیسری دنیا پر قبضہ کرکے وہاں کے وسائل کو لوٹ کر صنعتی ترقی کے معراج کو چھوا لیکن اس

بندر بانٹ اور لوٹ کھسوٹ میں پیچھے رہ جانے والے جرمنی بھی اس لوٹ کھسوٹ میں اپنے شراکت کے تگ و دو میں دو ہولناک جنگوں کو جنم دینے کا وجہ بنا یہاں بھی بنیادی وسائل تھے۔ قبضہ کبھی بھی اس خیال سے نہیں کیا جاتا کہ آپ مقبوضہ انسانوں کو ترقی دیں گے اور انکی زندگیاں بہتر بنادیں گے۔ قبضہ ہوتا ہی اسی لئے ہے کہ مقبوضہ علاقہ کے وسائل کی ملکیت حاصل کی جاسکے۔ یہ وسائل معدنیات کی شکل میں ہوسکتے ہیں، یا پھر ایک گزرگاہ کی حیثیت سے بھی۔ کسی پُر وسائل علاقہ تک رسائی کیلئے راستہ بھی تو لوٹ مار کے لئے ایک وسیلہ ہی ہوا کرتا ہے۔ کسی بھی علاقہ یا سرزمین کے کسی بھی حصے پر قبضہ کرنے کی نیت انہی بنیادوں پر ہوسکتی ہے کہ یا تو وہاں کے وسائل کی ملکیت حاصل کی جائے یا پھر اُس زمین کے دوسری جانب موجود وسائل تک رسائی کے لئے اُس سرزمین کو گزرگاہ کے طور پر استعمال کی جائے۔

آج اگر بلوچ سرزمین کو ہم عالمی حالات، طاقتوں کے اجارہ داریت قائم کرنے کا خواب، امریکہ و چین کے مفادات کے ٹکراو، دنیا کے بڑھتے ہوئے توانائی کی ضروریات اور سینٹرل ایشیاء کے توانائی کے خزانوں تک رسائی کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کریں تو یہ امر روزِ روش کی طرح عیاں ہوجاتا ہے کہ بلوچ سرزمین دنیا کیلئے دونوں صورتوں یعنی وسائل خیز سرزمین اور ایک اہم ترین گذرگاہ کی صورت میں انتہائی اہمیت اختیار کرچکا ہے، جہاں بلوچ سرزمین سونے، چاندی، تانبے، میتھین گیس، وغیرہ جیسے وسائل سے مالا مال ہے وہیں جغرافیائی حوالے سے اس کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ اہم ہے کہ یہ ایک طرف سے تو وسطی ایشیاء، جنوبی ایشیاء اور مشرق وسطیٰ کو بیک وقت جوڑنے والی واحد سرزمین ہے اور دوسری طرف سے یہ لینڈ لاکڈ سینٹرل ایشیاء افغانستان سے لیکر کیسپین تک کو گرم پانی سے جوڑنے والا آسان ترین اور نزدیک ترین راستہ ہے اور ساتھ ساتھ دنیا کے ''آئل کوریڈور'' آبنائے ہرمز سے چین کو جوڑنے کا سب سے سستا ترین اور قریب ترین راستہ بھی ہے، چین کے بڑھتے ہوئے توانائی کے ضروریات کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو بلوچستان اس کے معیشت اور توانائی ضروریات کیلئے زندگی اور موت کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

بلوچستان کے یہ بیش بہا وسائل اور مخصوص اور اہم جغرافیہ جہاں بلوچوں کیلئے ایک نعمت کی سی حیثیت رکھتا ہے لیکن وہیں خستہ قومی تشکیل، مضبوط ریاستی اداروں کی عدم موجودگی اور ضروری مہارت کی کمی کی وجہ سے یہ تاریخی طور پر قابضوں کو اپنی طرف کھینچتا آیا ہے جس کے وجہ سے ہی بلوچ ایک طویل غلامی سے نبرد آزما ہیں۔ کالونیل دور میں پرتگیزیوں اور انگریزوں کے حملے پھر پاکستان کا قبضہ بلوچ سرزمین اسی اہمیت کے شاخسانے ہیں اور 80 کے دہائی میں موجودہ روس اور سابقہ سوویت یونین بلوچستان کے اسی مخصوص جغرافیائی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک آزاد بلوچ سوشلسٹ ریاست کا حامی نظر آتا تھا کیونکہ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان کے زیر قبضہ رہ کر یہ مخصوص جغرافیائی سرمایہ دار ممالک کے سربراہ امریکہ کے زیر اثر رہے۔ انہی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے بلوچستان اور افغانستان کو ایک بفرزون بنانے کیلئے پہلے افغان ثور انقلاب کیلئے ہرممکن مدد کی یہاں تک افغانستان میں اپنی فوج اتار دی اور ساتھ ساتھ بلوچ مزاحمت کاروں کو ایک آزاد بلوچستان کیلئے ہرممکن مدد کرتا رہا تاکہ یہاں ایک سوویت نواز ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے جو ایک طرف سے تو سامراجی ریاستوں کیلئے سینٹرل ایشیاء کا دروازہ بند کردیتا دوسرا بلوچستان کے گرم پانی اسکے رسائی میں آجاتے۔ بلوچوں کے اس کمک و معاونت کیلئے سوویت یونین کو بلوچوں کی پُر درد زندگی نے مجبور نہیں کیا تھا، بلکہ اس لئے کہ وہ اس سرزمین کو اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتا تھا۔

آج جہاں دنیا میں قبضہ گیریت کے طریق بدل چکے ہیں، انیسویں صدی کے بعد دنیا نے محسوس کیا کہ دنیا کو بلا واسطہ اپنے فوجی طاقت کے ذریعے قابو میں رکھنا ممکن نہیں تو انہوں نے قبضہ گیریت کی ہیئت بدل دی۔ جس سے کالونیل دور کا خاتمہ اور نیو کالونیل دور کا آغاز ہوگیا۔ آج قبضہ غیر محسوسانہ انداز میں ہوتا ہے۔ آج ممالک جغرافیائی نہیں بلکہ معاشی زنجیروں میں جکڑے جاتے ہیں۔ نیوکالونیلزم میں طاقتور ممالک ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے اداروں کے ذریعے اقوام کی معیشت اور اس کے فیصلے اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں اور فری مارکیٹ اکانومی کے ذریعے اپنے ملٹی نیشنل کمپنیوں کو چھوٹ دیکر پرائیوٹائزیشن کے نام پر ان وسائل کو ایک غیر محسوسانہ انداز اور بظاہر منصفانہ طور سے لوٹ کر ٹرکل ڈاون اکانومی Trickle Down economy کو جنم دیتے ہیں۔ آج بلوچستان پر اگر ایک طرف سے زمینی سطح پر پاکستان قابض ہے تو دوسری طرف سے دیکھا جائے پاکستان کے معیشت کو اپنے کنٹرول میں رکھتے ہوئے اس لوٹ میں ساجھے دار خفیہ انداز میں عالمی طاقتیں ہی رہی ہیں۔ اسکی ایک مثال پیش کرنا چاہونگی کہ سیندک پروجیکٹ پر قابض تو پاکستان ہے لیکن اس سے جتنے بھی وسائل نکل رہے ہیں ان میں سے 60 فیصد چین جارہے ہیں، اسی طرح مستقبل میں گوادر کا بھی یہی حال ہوگا کہ اس پر قابض پاکستان ہوگا لیکن اس سے تمام تر فائدے چین ہی حاصل کرے گی اور چین کے اس کنٹرول سے خائف دوسرے سرمایہ دارانہ ممالک پاکستان کو اپنی طرف مائل کرکے یا اسے آئی ایم ایف کے ذریعے جکڑ کے بلوچستان پر نیو کالونیل

طریقے سے اپنا قبضہ چاہتے ہیں۔ اسی کھینچا تانی کی وجہ سے پاکستان بیچ میں فائدے بٹور رہا ہے آج پاکستان کے معیشت کا چکی جو انہی سرمایہ دارانہ ممالک کے خیرات نما امداد سے چل رہا ہے اس کی سب سے بڑی وجوہات میں سے ایک بلوچستان ہے، تبھی پاکستان، بلوچ وطن کی آزادی کو اپنی زندگی و موت سمجھتی ہے۔ حالانکہ انسانی آزادی سے انکار تو ناممکن بات ہونی چاہئے۔ لیکن پاکستان روزانہ کی بنیاد پر اپنے سینکڑوں سپاہیوں کی موت کو برداشت کر کے بلوچ وسائل کی ملکیت چاہتا ہے۔ گو کہ یہ وسائل پاکستان میں موجود عوام کے لئے کوئی بڑی معنی ہی نہیں رکھتے کیونکہ پاکستان کے پاس ابتک وہ مطلوبہ مہارت ہی نہیں کہ وہ ان وسائل کو اپنے مفادات کیلئے استعمال کر سکے لیکن مقتدر حلقہ اپنے سرمایہ دار مالکوں سمیت اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ وسائل کتنے قیمتی ہیں۔ سپاہی چاہے جتنے مرجائیں، انکی جگہ دوسرے بھرتی کرتے جائیں گے، بلوچ جنگ کے اخراجات کو پورا کرنے کیلئے ٹیکس پہ ٹیکس لگاتے جائینگے، لیکن بلوچ سرزمین سے دستبردار نہ ہونگے۔

اسی طرح عالمی سرمایہ دار کمپنیوں کی نظریں بھی بلوچ وسائل پر ہیں۔ وہ بھی اپنی صف بندیوں میں مصروف ہیں۔ ''پیسہ پھینک'' والی پالیسیاں بلوچ سرزمیں پر واضح طور پر دکھائی دے رہی ہے۔ ایک طرف سے بلوچ قومی تحریک کو سبوتاژ کرنے اور سعودیہ سمیت دوسرے عرب ممالک کے سنی توسیع پسندانہ عزائم کی بلوچستان میں تکمیل کیلئے مذہبی تنظیموں کا رُخ کشمیر سے بلوچستان کی طرف موڑا جارہا ہے جس پر کروڑوں نہیں بلکہ اربوں روپے خرچ کئے جا رہے ہیں، ڈیتھ اسکواڈز پر اربوں روپے خرچ کئے جارہے ہیں، ریاستی سربراہی میں منشیات فروشوں، مذہبی تنظیموں اور streetcriminals کو باہم مربوط کر کے بلوچ سرزمین کو بدستور غلام رکھنے اور مخصوص مفادات کی تکمیل کی سعی کی جارہی ہے تو دوسری طرف سے بلوچ وسائل پر کنٹرول اور اس اہمیت کے حامل جغرافیہ پر دسترس حاصل کرنے کیلئے ان سب کے چین سمیت دو سرے عالمی مالیاتی اداروں سے بھی ملتی ہیں، عالمی جنگوں سے بھی مربوط نظر آتی ہیں، لیکن ان سب ریشہ دوانیوں کے باوجود بلوچ قومی تحریک کمزور افرادی اور معاشی قوت کے حامل ہونے کے باوجود نا صرف جاری ہے بلکہ اب خود کو منواتی ہوئی نظر آتی ہے اگر تحریک خود کو مزید فعال کرنے میں کامیاب ہوجائے تو بعید نہیں مشرقِ وسطی میں کردوں کی طرح بلوچ بھی خود کو اس خطے میں ایک اسٹیک ہولڈر اور فیصلہ کن کردار کے طور پر منوانے میں کامیاب ہوجائے۔ ان تمام مصائب اور چیلنجز کے باوجود بلوچ قومی تحریک کا خود کو قائم رکھنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بلوچ قومی جہدءِ آزادی ایک بالکل واضح قومی تضاد پر کھڑی ہے جسے معاشی استحصال و قومی جبر نے مزید استقامت اور واضح پن بخشی ہے۔ یہ تضاد نا کسی مالیاتی ادارے کا بنایا ہوا بناوٹی تضاد ہے اور نا ہی یہ جدوجہد کسی طاقت کا پروکسی جنگ ہے، اس کی بنیادیں بلوچ تاریخی تسلسل اور بلوچ قومی شناخت سے جڑی ہے اسلئے اسے یہ تمام نوآبادیاتی استحصالی اور جبری ہتھکنڈے روک نہیں پارہے۔

بلوچ قومی تحریک کی بنیادی اساس اس کا سچا اور معروضی حالات سے ہم آہنگ نظریہ ہے۔ ہمارے نا توسیع پسندانہ عزائم ہیں اور نا ہم کسی اور قوم کے ذمین و وسائل میں سے کچھ چاہتے ہیں ہم وہ چاہتے ہیں جو ہمارا ہے۔ بلوچ قومی تحریک ایک ترقی پسند قومی تحریک ہے نا کہ یہ ایک رجعتی نسلی منافرت پر مبنی تحریک ہے۔ مظلوم کہیں بھی ہو، مظلوم ہے۔ ہمیں خوشی ہوگی اگر پنجاب کے عوام اپنے حقوق کی جدوجہد کریں، پشتون اپنی مسخ شدہ قومی شناخت کو دوبارہ منظّم کرنے کی کوشش کریں، سندھی اپنے مادرِ وطن کے مالک خود بن جائیں۔ ہم دنیا کے ہر مظلوم و محکوم انسان وقوم کیلئے نیک خواہشات رکھتے ہیں لیکن اسکے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی واضح طور پر کہنا چاہتے ہیں کہ بلوچ قومی تحریک بلوچ عوام کی آزادی کی تحریک ہے، بلوچ قوم کی آزادی کی جدوجہد، بلوچ وسائل و سرزمین پر عام بلوچ کے ملکیت و اختیار کی جدوجہد ہے، اگر کوئی بھی عالمی، علاقائی سرمایہ دار اس سرزمین یا اسکے وسائل کی ملکیت کے خواب دیکھ رہی ہے تو یہ محض خواب ہی رہے گا۔ اس جدوجہد کی آبیاری نوجوانوں کی خون سے ہورہی ہے۔ یہ جدوجہد ناقابلِ شکست ہے، کیونکہ قبضہ ایک لالچ ہے، ایک ہوس ہے لیکن مزاحمت ایک محبت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اپنے سرزمین سے محبت، اپنی بقاء سے محبت، اپنی شناخت سے محبت اور محبت اپنے کمزور ترین حالت میں بھی لالچ سے لاکھوں گُنا طاقتور اور عظیم تر ہے۔

☆☆☆

دنیا کے ان معاشی، معاشرتی، عسکری اور سماجی ناہمواریوں کو دیکھ کر اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ، دنیا ایک نئی تقسیم کا متقاضی ہے۔ یہاں سوال اٹھ سکتا ہے کہ اس تقسیم کے خدوخال کیا ہوسکتے ہیں میں یہاں پال ہنٹگٹن کے تہذیبوں کے تصادم کے نظریے سے پہلوتہی کرتے ہوئے یہ کہنے کی آزادی چاہوں گی کہ مستقبل میں اس تقسیم کے خدوخال اور نوعیت ہر جگہ مختلف ہوگی، اس تقسیم کی بنیادیں ہر خطے کے مخصوص تضادات پر منحصر ہونگے۔ جہاں یہ تضاد معاشی ناہمواری کی صورت میں ہے وہ مخصوصی طبقاتی جہتوں میں نمو پاتے ہوئے اپنا اظہار طبقاتی بنیادوں پر کریں گے اور جہاں جہاں یہ تضاد ''مذہبی فرقوں'' کا ہے، وہاں تقسیم کی بنیاد ''مذہبی فرقے'' ہوتے جائیں گے اور جہاں ''اہم تضاد'' قومی ہیں، وہاں پر تقسیم کی نوعیت کو جلد یا بدیر ''قومی'' بنیادوں پر ہی ہونا پڑے گا۔

Students for a Free Tibet(SFT)
اور تبت کی تحریک آزادی

قائم خان بلوچ

تاریخ عالم کے گزرے ہوئے یا حالیہ ادوار میں جاری سیاسی تحاریک میں طلباء وطالبات کا کردار نمایاں رہا ہے۔ وہ تحاریک سماجی، سیاسی، معاشی واقتصادی یا پھر زندگی کے کسی بھی شعبے میں چلی ہوں طلباء و طالبات کا کردار ایک ناقابلِ تردید حقیقت رہا ہے۔ حالیہ دور میں جاری سیاسی تحریکوں میں بالخصوص آزادی کی تحریکوں میں طلباء و طالبات مختلف ممالک میں اپنے تاریخی کردار کو دیگر طبقے کے افراد کے شانہ بشانہ نبھا رہے ہیں۔ انہی کرداروں میں سے ایک تبت کی تحریک آزادی میں سرگرم تبّتی طلباء طالبات (اسٹوڈنٹس) کی تنظیم Students for a Free Tibet(SFT) ہے جس نے پرامن ذرائع جدوجہد کو استعمال میں لاتے ہوئے متعدد مواقع پر سیاسی پریشر (Political Pressure) ڈالنے کے ذریعے کئی حوصلہ افزاء نتائج اور کامیابیاں حاصل کی ہیں جو تبت کی تحریک آزادی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ تبت چائنا کے زیرِ قبضہ ایک خطہ ہے جس پر چائنا نے وہاں کے مقامی باشندوں کی خواہشات کے برعکس بزورِ شمشیر قبضہ جمایا ہوا ہے اور اسکے باشندے اپنے تاریخی جغرافیائی حیثیت اور جداگانہ نسلی و ثقافتی بنیادوں پر چائنا سے آزادی کی تحریک چلا رہے ہیں۔ اس تحریک کے روح رواں تبتیو ں کے روحانی پیشوا دلائی لامہ ہیں۔ اس تحریک میں ایس ایف ٹی ایک نمایاں کردار ادا کررہی ہے۔ ایس ایف ٹی کے سیاسی جدوجہد، اسکے طریقہ کار اور پرامن سیاسی پریشر کے ذریعے کئی کامیابیوں کے حصول کا مطالعہ کرنے سے قارئین کو یہ بات سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ سیاسی و انقلابی تحریکوں میں طاقت کے دیگر ذرائع کے ساتھ ساتھ سیاسی پریشر، لابنگ، کیمپینگ اور سفارتکاری بھی اپنی جگہ ایک ناگزیر ذریعہ اور ایک خاص اہمیت و افادیت رکھتا ہے اور اس میں سماج کا متحرک ترین طبقہ طلباء طالبات بھی ایک نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایس ایف ٹی کے جدوجہد کو قارئین کے مطالعے کیلئے یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

ایس ایف ٹی جس کا مخفف Students for a Free Tibet ہے کا قیام 1994 میں عمل میں لایا گیا۔ تبت کی تحریک آزادی میں طلباء و طالبات کے فعال کردار کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے چند تبّتی آزادی پسند سیاسی کارکنوں اور تبّتی اسٹوڈنٹس نے اس تنظیم کی بنیاد رکھی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ایس ایف ٹی تبت کے اندر جدوجہد کرنے کے بجائے باہر ممالک میں مقیم تبّتی طلباء وطالبات پر مشتمل ایک انٹرنیشنل نیٹ ورک ہے۔ عالمی سفارتکاری اور لابنگ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایس ایف ٹی عالمی سطح پر جدوجہد کررہی ہے۔ اپنے قیام کے ساتھ ہی تنظیم کی ممبرشپ تیزی سے بڑھتی گئی اور دو سال کے اندر ہی دنیا کے مختلف ممالک میں اسکے 150 چیپٹرز (Chapters) قائم ہوئے۔ ابتدائی طور پر تنظیم نے اپنی جدوجہد کا محور ساتھی طلباء وطالبات میں تبّتی تاریخ وثقافت، چینی قبضے اور آزادی کی تحریک کے متعلق آگاہی پھیلانے کو بنایا۔ اور تیزی سے باہر ممالک میں مقیم تبّتی اسٹوڈنٹس کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ فی الوقت ایس ایف ٹی 35 ممالک میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں، کالجوں، ہائی اسکولوں اور عام کمیونٹیوں میں اسکے 650 چیپٹرز ہیں۔ تنظیم کا ہیڈکوارٹر (ہیڈآفس) نیویارک (امریکہ) میں ہے جبکہ ٹورنٹو (کینڈا)، دھرمشالہ (انڈیا) اور لندن (برطانیہ) میں بھی اسکے دفاتر موجود ہیں۔

تنظیم کا پالیسی ساز ادارہ Board of Directors کہلاتا ہے جو اسکے تمام اسٹریٹیجک پالیسیوں کو ترتیب دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ Board of Directors کے ممبران کا چناؤ براہ راست چیپٹرز کے ممبران اور Long-Term Volunteers (تنظیم کے ساتھ طویل مدت سے جدوجہد کرنے والے رضاکار) کے ذریعے عمل میں لایا جاتا ہے۔ اسکے بعد Board of Directors تنظیم کے سربراہ (Executive Director) کو منتخب کرتا ہے اور Executive Director اپنے باقی اسٹاف جس میں Deputy Director، Director, Director of Tibet، Action Institute (تنظیم کا تربیتی ادارہ) اور

مختلف خطوں کے ڈائریکٹرز شامل ہیں کو چنتا ہے۔فی الوقت Tenzin Dolkar نامی ایک خاتون تنظیم کے Executive Director ہیں جو امریکی نژاد تبتی ہیں۔

ایس ایف ٹی اپنا مقصد تبت کی آزادی کو بناتے ہوئے سیاسی تعلیم، سیاسی وکالت وسفارتکاری کیلئے پرامن اور عدم تشدد پر مبنی ذرائع کو زیر استعمال لاتے ہوئے میدان کارزار میں محوِ جدوجہد ہے۔جس نے اب تک سیاسی پریشر کے ذریعے کئی حوصلہ افزاء کامیابیاں حاصل کی ہیں۔تنظیم تبت میں چائنا کی لوٹ کھسوٹ اور انسانی حقوق کی پامالیوں کو آشکار کرنے کے ساتھ ساتھ تبت کی تاریخی بنیادوں پر جغرافیائی و سیاسی آزادی و حق خود ارادیت کیلئے جدوجہد کررہی ہے۔ایس ایف ٹی کو چینی حکام کے غیرملکی دوروں کے دوران بڑے پیمانے پر احتجاجی مظاہروں کے انعقاد کیلئے خاص طور پر جانا جاتا ہے۔تنظیم سیاسی اقدامات کے ذریعے چینی حکام اور ساتھ ساتھ تبتی پارلیمنٹیرینز پر سیاسی پریشر بھی بڑھاتا رہتا ہے۔تنظیم تین پہلوؤں کو اپنی جدوجہد کا محور بنائے ہوئے ہے۔

اول: سیاسی(Political) ، دوئم: معاشی و ماحولیاتی(Environmental and Economic RIghts)، سوئم: انسانی حقوق(Human Rights)۔جن کا باری باری احاطہ ہم اس مضمون میں کریں گے۔

1۔سیاسی(Political):

ایس ایف ٹی سیاسی میدان میں مختلف سیاسی طریقوں اور اقدامات کے ذریعے چینی حکومت اور تبتی پارلیمنٹیرینز پر تبت کی آزادی کیلئے دباؤ بڑھارہی ہے۔ساتھ ساتھ دنیا کے مختلف ممالک میں سیاسی لابنگ کے ذریعے تبت کی تاریخی جداگانہ حیثیت، چینی قبضے اور موجودہ صورتحال کے بارے میں دنیا کو آگاہی فراہم کرکے تبت کی آزادی کیلئے راہ ہموار کررہی ہے۔ اپنی اس جدوجہد میں تنظیم مختلف Long-Term Campaigns چلارہی ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔Unite for Tibet:

اس Campaign میں دنیا بھر کے ممالک پر زور دیا جاتا ہے کہ وہ یک زبان ہوکر تبت کی آزادی کیلئے چینی حکومت پر دباؤ ڈالیں۔

اس ضمن میں ای میلز، فیکس، حکومتی وعوامی نمائندوں سے براہ راست ملاقات کے ذریعے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ بجائے کہ تبت کی آزادی کے متعلق ہر کوئی ملک الگ بیان دے۔ مختلف ممالک کی حکومتیں باہمی مشورے سے ایک مشترکہ حکمت عملی ترتیب دے کر تبت کی آزادی کیلئے اس حکمت عملی کے تحت چائنا پر دباؤ ڈالیں۔ یہ ایک Long-Term Campaign ہے جو ایک طویل عرصے سے جاری ہے اور مختلف اوقات میں ایس ایف ٹی کے نمائندے مختلف ممالک کے نمائندوں سے رابطہ کرکے انہیں اس فارمولے پر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۲۔March 10:

10 مارچ کو تبت پر چینی قبضے کے خلاف احتجاج کے طور پر منایا جاتا ہے۔10 مارچ 1959 کو ہزاروں تبتیوں نے تبت پر چینی قبضے کے خلاف تبت کے دارالحکومت لاسا میں احتجاج کیا تھا اور اب ہر سال ایس ایف ٹی اس دن کو تبت پر قبضے کیخلاف احتجاج کے طور پر مناتی ہے۔اس دن دنیا کے مختلف ممالک میں 10 مارچ ریلی کے نام سے ریلیوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔اور تمام لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔

۳۔Tibetan Independence Day:

تنظیم ہر سال 13 فروری کو یوم آزادی تبت کے طور پر مناتی ہے۔اس ضمن میں مختلف ممالک میں تقریبات منعقد کی جاتی ہیں اور آزاد تبت کے جھنڈے لہرائے جاتے ہیں۔خود ایس ایف ٹی کے نمائندے مختلف ممالک کے عوامی نمائندوں سے ملاقات کرکے انہیں چائنا اور تبت کے درمیان رشتے کے متعلق آگاہی فراہم کرکے انہیں تبت کی آزادی کے حق میں آواز اٹھانے کا کہتے ہیں۔اس دن کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ 13 فروری 1913 کو تبت نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تھا مگر چائنا نے اس پر دوبارہ قبضہ کرلیا تھا۔2013 میں اس دن کو تبت کی اعلان آزادی کے سو سال پورے ہونے پر تقریبات کا انعقاد کرکے منایا گیا۔دنیا کے 30 مختلف شہروں میں

ایس ایف ٹی اپنا مقصد تبت کی آزادی کو بناتے ہوئے سیاسی تعلیم، سیاسی وکالت وسفارتکاری کیلئے پرامن اور عدم تشدد پر مبنی ذرائع کو زیر استعمال لاتے ہوئے میدان کارزار میں محوِ جدوجہد ہے۔جس نے اب تک سیاسی پریشر کے ذریعے کئی حوصلہ افزاء کامیابیاں حاصل کی ہیں۔تنظیم تبت میں چائنا کی لوٹ کھسوٹ اور انسانی حقوق کی پامالیوں کو آشکار کرنے کے ساتھ ساتھ تبت کی تاریخی بنیادوں پر جغرافیائی و سیاسی آزادی و حق خود ارادیت کیلئے جدوجہد کررہی ہے۔ایس ایف ٹی کو چینی حکام کے غیرملکی دوروں کے دوران بڑے پیمانے پر احتجاجی مظاہروں کے انعقاد کیلئے خاص طور پر جانا جاتا ہے۔تنظیم سیاسی اقدامات

منعقد ان تقریبات میں ان ممالک کے منتخب عوامی نمائندوں نے شرکت کر کے تبتی لوگوں سے اظہار یکجہتی کی۔ 13 فروری کے متعلق ایس ایف ٹی کا نعرہ ہے'' Secure the Past, Shape the Future''۔ایس ایف ٹی اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ مقبوضہ خطوں میں یومِ آزادی منانا آزادی کی تڑپ اور خواہش کا برملا اظہار ہے۔

۴۔Engage your Government:

اس Campaign میں دنیا میں رہنے والے تمام افراد سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں پر ای میلز، فیکس، فون کالز اور براہ راست ملاقاتوں کے ذریعے تبت کی آزادی کے مسئلے کو چینی حکام سے اٹھانے کیلئے دباؤ ڈالیں۔اس ضمن میں مختلف طبقہ فکر کے لوگوں سے رابطہ کیا جاتا ہے۔

۵۔Lobby for Tibet:

ہر سال ایک مخصوص دن متعین کر کے تبت کے آزادی پسند جن میں ایس ایف ٹی کے ممبران بھی شامل ہوتے ہیں، دنیا کے مختلف ممالک میں حکومتی وعوامی نمائندوں سے ملاقات کر کے تبت کی آزادی کے حق میں آواز اٹھانے کیلئے لابنگ کرتے ہیں ۔ اس دن کو وہ Lobby Day کا نام دیتے ہیں۔

مارچ 2012 میں 100 افراد پر مشتمل تبتی آزادی پسندوں کے ایک وفد نے جس میں ایس ایف ٹی کے نمائندے بھی شامل تھے، امریکی ایوان نمائندگان سے ملاقات کی اور ان سے یہ درخواست کی کہ وہ چائنا پر یہ دباؤ ڈالیں کہ وہ تبتیوں کے خلاف کریک ڈاؤن کا خاتمہ کرے۔جسکے نتیجے میں امریکی کانگریس نے ایک قرارداد پاس کی جس میں چائنا کی تبت میں غلط پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

اسی طرح 2008 میں جب بیجنگ (چائنا) میں اولمپکس کے کھیلوں کے عالمی مقابلے کا انعقاد کیا جارہا تھا اور ان کھیلوں کے افتتاح کیلئے اولمپک ٹارچ ریلی منعقد کی جارہی تھی تو اس موقع پر Sanfransisco میں واقع Golden Gate Bridge پر چائنا کی جانب سے اولمپکس کھیلوں کا سرکاری بینر آویزاں کر دیا گیا اور اس پر سرکاری نعرہ One World, One Dream درج تھا۔اسی جگہ پر سرکاری بینر کے ساتھ ایس ایف ٹی نے اپنا بینر آویزاں کر دیا جس پر ''Free Tibet'' تحریر تھا۔ جو اولمپکس کھیلوں کے سرکاری بینر کے برابر کے سائز کا تھا ۔ اس ڈرامائی اقدام نے عالمی میڈیا میں ایک سنسنی خیز خبر کی حیثیت حاصل کر لی ۔ اولمپکس کھیلوں کے دوران چلائی جانی والی Campaign میں تنظیم نے دیگر بہت سے سیاسی اقدامات کیئے جن سے تبت کی صورتحال کو کافی پذیرائی ملی اور اولمپکس ٹارچ ریلی میں شامل کم از کم دو مشعل برداروں نے تبت کی آزادی کے حق میں اپنے اپنے بیانات دیئے۔

چینی حکومت کے اولمپکس کھیلوں کو پر امن بنانے کیلئے تمام موثر اقدامات کے باوجود ایس ایف ٹی کے 70 ممبران نے بیجنگ میں 8 مقامات پر احتجاجی مظاہرے کیئے جن میں سے 55 کو چینی پولیس نے گرفتار کر لیا۔

2۔Environmental and Economic Rights:

جدوجہد کے اس پہلو میں ایس ایف ٹی نے ایک Long-Term Strategy اپنائی ہوئی ہے۔ جسکے تحت تبت پر قبضے کو چائنا کیلئے اس قدر مہنگا بنا دیا جائے کہ اس کیلئے اسے برقرار رکھنا مشکل ہو جائے۔ اس اسٹرٹیجی کی رو سے تنظیم ملٹی نیشنل اور غیر ملکی کمپنیوں کو چائنا کے ساتھ تجارت کرنے سے روکنے اور دیگر ممالک کے افراد کو چینی کمپنیوں کے مصنوعات کا بائیکاٹ کروانے کیلئے Campaign چلا رہی ہے۔ اس مقصد کیلئے وہ فی الوقت دو بڑے Campaigns پر اپنی توجہ مرکوز کیئے ہوئے ہے۔

ا۔Boycott made in China:

اس Campaign کے تحت تبت کے اپنے لوگوں اور دنیا کے دیگر افراد سے چینی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کی جاتی ہے۔ اس Campaign میں ایس ایف ٹی کے ساتھ دیگر بہت سے آزادی پسند تنظیمیں شریک ہیں۔اس ضمن میں وہ دنیا کے متعدد کمپنیوں، تنظیموں کو ای میلز، فون کالز اور براہ راست رابطوں کے ذریعے اور سوشل نیٹ ورکنگ کے ذریعے عام لوگوں کو تبت پر چینی قبضے، تبت کی تاریخی حیثیت اور چائنا کے لوٹ کھسوٹ اور ظلم و استحصال کے بارے میں آگاہی فراہم کر کے احتجاجاً چینی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔

۲۔Stop Mining Tibet:

اپنے معدنی وسائل کی وجہ سے تبت چینی حکومت کے ساتھ ساتھ غیر ملکی کمپنیوں کے لئے بھی پرکشش ہے۔ چینی حکومت نے متعدد غیر ملکی کمپنیوں کے اشتراک سے تبت کے معدنی وسائل کی لوٹ کھسوٹ کے عمل کو جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں چینی باشندوں کی تبت میں نوآبادکاری کیلئے بہت سے پروجیکٹ شروع کیئے ہیں۔چینی حکومت کے انہی عزائم کو ناکام بنانے کیلئے دیگر آزادی پسندوں کے ساتھ ساتھ ایس ایف ٹی نے بھی Stop Minning Tibet کے نام سے ایک Long-Term Campaign شروع کی ہوئی ہے۔جس کے تحت غیر ملکی خاص طور پر برطانوی اور کینڈین مائننگ کمپنیوں پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ وہ تبت کے معدنی وسائل کی لوٹ کھسوٹ میں چائنا کے ساجھے دار بننے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔ایس ایف ٹی کے اسی سیاسی دباؤ کے تحت چائنا کی ایک مائننگ کمپنی

نے Markham Tibet میں جاری اپنے Hazardous Foxic Minniing Operation کو بند کر دیا تھا۔

2005 میں ایس ایف ٹی نے ایک World Wide Campaign چلائی جس میں کینڈا کی ایک کمپنی Bombardier کو ہدف تنقید بنایا گیا تھا جس نے چینی حکومت کو اُس ریلوے لائن کی تعمیر کیلئے ٹیکنالوجی فراہم کیا تھا جو تبت اور چائنا کو ملاتی تھی۔ تنظیم کا موقف تھا کہ ریلوے لائن کی تعمیر میں شراکت دار بن کر Bombardier نے اپنے آپکو تبت پر قبضے میں حصے دار بنایا ہے۔

1999 میں ورلڈ بینک نے چینی حکومت کے اشتراک سے تبت کے نواحی علاقوں میں Poverty Reduction Project کا آغاز غربت کے خاتمے کے نام پر کیا مگر ایس ایف ٹی نے اس پروجیکٹ کے خلاف بڑے پیمانے پر Campaign چلائی۔ تنظیم کا موقف تھا کہ اس پروجیکٹ کے ذریعے چینی حکومت تبت کے پہاڑی اور عدم رسائی والے علاقوں میں سڑکوں کی تعمیر اور آبپاشی کا نظام قائم کرنے کی صورت میں بڑی تعداد میں چینی آبادی کی تبت میں نوآبادکاری کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ تنظیم نے اس پروجیکٹ کے خلاف اپنے Campaign میں ورلڈ بینک پر دباؤ بڑھانے کیلئے بینک کے عہدیداروں کو فیکس، ای میلز کیئے۔ عہدیداروں کے درمیان لابنگ کی، بینک کی عمارت پر اس پروجیکٹ کے خلاف بینر آویزاں کیئے، میڈیا کے ذریعے اسکی تشہیر کی اور بینک کی عمارت کے باہر احتجاجی کیمپ لگانے کی صورت میں ورلڈ بینک سے اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا۔ اس احتجاج کی بناء پر ورلڈ بینک نے اس پروجیکٹ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ جسکے بعد چینی حکومت نے ورلڈ بینک کو سیاسی دباؤ کے باعث پروجیکٹ سے دستبردار ہونے پر تنقید کا نشانہ بنایا۔

3۔Human Rights:

انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کے میدان میں ایس ایف ٹی چائنا کی جانب سے تبت میں کی جانے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی دنیا میں خوب تشہیر کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ چینی حکومت کی جانب سے گرفتار شدہ تبّتی آزادی پسندوں اور عام باشندوں کی رہائی کیلئے بھی بڑے پیمانے پر Campaign چلا رہی ہے۔ اور مختلف انسانی حقوق کے عالمی اداروں اور جمہوری ممالک کے نمائندوں سے رابطہ کر کے انہیں تبت میں انسانی حقوق کی صورتحال سے آگاہی دے رہی ہے۔

مثلاً 2012 میں ایس ایف ٹی کے ڈپٹی ڈائریکٹر Tendolkar اور انٹرنیشنل ڈائریکٹر Kate Woznow نے اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق نوی پلے سے ملاقات کی اور انہیں تبت میں چائنا کی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر بریفنگ دی اور ان سے ان خلاف ورزیوں کا نوٹس لینے کا مطالبہ کیا۔ ایک ہفتے کے بعد نووی پلے نے ایک بیان جاری کرتے ہوئے چائنا کی تبت میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی مذمت کی۔

Tibet Action Institute:

یہ ایس ایف ٹی کا تربیتی ادارہ ہے جو ہزاروں تبّتی نوجوانوں کو بڑے پیمانے پر تربیت فراہم کرتی ہے۔ Lhadon Thethong نامی ایک خاتون اس ادارے کے ڈائریکٹر ہیں۔ یہ ادارہ خاص طور پر تحریک آزادی میں پرامن سیاسی جدوجہد کی طاقت و اہمیت سے نوجوانوں کو روشناس کراتی ہے۔ ساتھ ساتھ موثر سیاسی اسٹریٹجی کی منصوبہ بندی بھی سکھاتی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے World Wide Campaigns کیسے چلائی جاتی ہیں یہ ادارہ باقاعدہ نوجوانوں کی اسی لحاظ سے تربیت کرتی ہے۔ ایک اور خاص تربیت جو یہ ادارہ تبّتی نوجوانوں کو فراہم کرتا ہے وہ یہ کہ کس طرح جدید ٹیکنالوجی کا محفوظ استعمال کیا جائے تا کہ آپکی خفیہ معلومات دشمن اور دیگر غیر متعلقہ افراد کے ہاتھ نہ لگیں۔ مثلاً کمپیوٹر کے استعمال کے دوران کن مواقعوں پر آپکے کمپیوٹر کے Hard Drive سے ڈیٹا چوری ہوسکتے ہیں۔ آپکا ای میل اکاؤنٹ کب ہیک ہوسکتا ہے اور کیسے آپکے ای میل ان باکس سے پیغامات چوری ہوتی ہیں۔ آپکے موبائل فون کو کیسے Trac کیا جاسکتا ہے۔ آپکے موبائل فون اور سم کارڈ کب آپکے لوکیشن کو ظاہر کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس تربیتی ادارے میں سیاسی گُر اور سفارتکاری کے طریقوں کے ساتھ ساتھ ٹیکنالوجی کے موثر استعمال اور اسکے نقصانات سے بچنے کیلئے باقاعدہ تربیتی کورس اور لیکچرز ترتیب دیئے جاتے ہیں۔

☆☆☆

''ابتدائی طور پر تنظیم نے اپنی جدوجہد کا محور ساتھی طلباء و طالبات میں تبّتی تاریخ و ثقافت، چینی قبضے اور آزادی کی تحریک کے متعلق آگاہی پھیلانے کو بنایا۔ اور تیزی سے باہر ممالک میں مقیم تبّتی اسٹوڈنٹس کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ فی الوقت ایس ایف ٹی 35 ممالک میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں، کالجوں، ہائی اسکولوں اور عام کمیونٹیوں میں اسکے 650 چیپٹرز ہیں۔ تنظیم کا ہیڈکوارٹر (ہیڈ آفس) نیویارک (امریکہ) میں ہے جبکہ ٹورنٹو (کینڈا)، دھرمشالہ (انڈیا) اور لندن (برطانیہ) میں بھی اسکے دفاتر موجود ہیں''۔

جو لوگ خود سے لڑسکتے ھیں انھیں دنیا میں آزادتصورکیا جاتا ھے۔

﴿دشت بلنگور میں جلسہ عام سے جونیئر وائس چیئرمین کمال بلوچ کا خطاب﴾

آج کا عظیم الشان جلسہ زیر صدارت بلوچ نیشنل فرنٹ کے سیکریٹری اور بلوچ عوام کو تنظیم اور پارٹی کے بارے میں آگاہی دینے والے ہمارے لیڈر واجہ ڈاکٹر منان بلوچ اور انکے ہمراہ ہمیں حوصلہ دینے والے شہید زاہد جان کے بزرگ والد حاجی ابراھیم اور آج کے مجلس میں موجود بی آر پی کے مرکزی کمیٹی کے ممبر بابا بلوچ، بی ایس او آزاد کے مرکزی کمیٹی کے ممبر سنگت لطیف بلوچ اور شہید آصف جان کے والد اور بی این ایم کے مرکزی رہنماء واجہ یوسف بلوچ جنہوں نے آج کے دن یعنی 20 اگست کو اپنے بیٹے کی لاش وصول کی۔

میں سمجھتا ہوں جو لوگ خود سے لڑ سکتے ہیں انھیں دنیا میں آزاد تصور کیا جاتا ہے اور یہاں پر موجود تمام لوگ جو موجود ہیں وہ غلامی کے خلاف لڑ رہے ہیں اسلئے میں کہتا ہوں کہ آپ لوگوں کو آزادی مبارک ہوں۔ جدوجہد مبارک ہو۔ یہ عمل مبارک ہو اور منزل تک، میں سمجھتا ہوں کہ یہاں ایک آزاد قوم موجود ہے جو غلامی کے خلاف لڑ رہی ہے۔ انھیں پاکستان نے غلام رکھا ہے مگر غلام رکھ نہیں سکتا۔ آج کا جلسہ عام میرے لیڈر میرے دوست سنگت رضا نگیر اور امداد بلوچ کے نام پر رکھی گئی ہے شہید رضا جہانگیر ہر وقت ایک بات کہتا تھا کہ میری دعا ہے کہ دشمن کے ہاتھ آنے سے بہتر ہے میں شہید ہو جاؤں اور اسی طرح انکی خواہش پوری ہوئی اور وہ سرخ رو ہوئے میں ان کو سرخ سلام پیش کرتا ہوں اس کی ہمت کو سلام پیش کرتا ہوں اگست کے مہینے کو میں کیا نام دوں کہ اس مہینے کا ہر دن ہمارے لئے عجیب و غریب ہے۔ اگست کے پہلے دن سے لے کر آخری 31 اگست تک ہر روز ہمیں دشمن کی طرف سے کسی نہ کسی کی لاش وصول ہوئی۔ شہید اکبر خان شہید رسول بخش مینگل شہید حاجی رزاق گل، شہید مجید لانگو جیسے لیڈر ان شہید ہوئے ہیں اسی مہینے کا 11 اگست ہماری آزادی کی دن ہے اور یہ تمام بربریت بھی اسی مہینے میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مہینہ ہمیں جدوجہد کرنے کا درس دیتا ہے میں ایک بات یہاں واضح کر دوں کہ بلوچ اور بلوچستان دنیا کے کسی بھی طاقت کے نہیں ہو سکتے، یہاں ایرانی گجر ہمیں اپنا مزید غلام نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی پاکستان، کیونکہ ہم میں ہمت ہے اور حوصلہ ہے پارٹی اور تنظیم ہے آج ہمارے ماں اور بہنیں دعاؤں کے ساتھ ہمارے ہم قدم ہیں ہمارے ساتھ بانک کریمہ جیسی لیڈر موجود ہے،، چیرمین خلیل اور ڈاکٹر منان جیسے لیڈر ہیں بلوچ نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد ہے جو کہ بلوچ جدوجہد کو ایک بہتر انداز میں دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں وہ سب بی ایس او، بی این ایم اور بی آر پی کے پیداوار ہیں میں آج 15 ہزار لوگوں کے اس سمندر کے توسط سے یہ کہنا چاہوں گا کہ ہمارے حوصلے بلند ہیں کمزور نہیں ہیں اپنے عوام سے کہتا ہوں، دنیا سے کہتے ہیں اور اپنے دشمن سے بھی کہتے ہیں کہ بلوچ قوم نے 27 مارچ 1948 سے اپنی جنگ کا آغاز کیا ہے اور آج تک بلوچ عوام نے جھنڈے کو بلند رکھا ہے اور آزادی تک یہ جھنڈا بلند ہی رہے گا، ضرور کمزوریاں ہونگی، دوستوں کی کمی محسوس ہوگی سنگت شہید ہونگے اور کچھ تھک بھی جائیں گے، لیکن بلوچ آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھنے والے بہت ہونگے۔ آج پاکستان اور پاکستانی ادارے جو بلوچ یکجہتی کے مخالف ہیں بلکہ بلوچ یکجہتی کو توڑنے کیلئے مختلف حربے آزمارہے ہیں۔ مذہب کے نام پر قوم پرستی کے نام پر اور ڈاکٹر مالک جیسے دلالوں کے نام پر بلوچ قوم کو دھوکہ دے رہے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بلوچ قوم کے پاس لیڈران ہیں جس وقت عطاء اللہ اور غوث بخش نے جدوجہد کا سودا کیا تو وہاں پر ڈاکٹر اللہ نذر جیسے نوجوان بھی ضرور نکلے ہیں جنہوں نے آزادی کی جنگ پھر سے شروع کی ہے، ہمیں یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ سردار و نواب کبھی کسی کے ہمراہ نہیں ہو سکتے بلکہ وہ لوگ جو آزادی کیلئے لڑ رہے ہیں وہ اپنا سر قربان کرنے پر تیار ہیں۔ درس گاہِ آزادی جناب نواب خیر بخش جو کہ خود کو ایک نواب نہیں کہتے تھے ہمیں ان جیسے عظیم لیڈران کی رہبری حاصل ہے۔ بی ایس او نے درس گاہ آزادی کے لقب سے نوازا ہے۔ جس وقت عطاء اللہ، ڈاکٹر مالک جیسے لوگ بلوچ جُہد کو چھوڑ کر پارلیمنٹ چلے گئے تو نواب خیر بخش مری جیسے عظیم انسان 71 سے لیکر زندگی کی آخری سانس تک صرف بلوچ آزادی کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ انہوں نے ہمیں آزادی کا راستہ دکھایا، اسی راستے پر آگے بڑھنے والے میر نبی اور ڈاکٹر اللہ نذر جیسے انسان ہیں۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ عوامی طاقت، میں اُن سے کہنا چاہتا ہوں کہ آ کے دیکھو، عوامی

طاقت آج دشت میں موجود ہے،عوامی طاقت ہم نے بالگتر، تمپ، پنجگور، میں دکھایا ہے، کیونکہ بلوچ عوام آج پارٹیوں کے ہمراہ ہے۔ بلوچ عوام کا بھروسہ اس لیڈر پر ہے جو قوم میں،عوام میں موجود ہے۔ وہ لوگ جو باہر بیٹھ کر بلوچ وسائل کی سودا بازی کررہے ہیں۔ ہم نے بار ہا کہا ہے کہ ہمیں اپنے عوام پر یقین ہے۔ ہم عوامی طاقت ہی کے ذریعے آزادی حاصل کریں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمیں آزادی نہیں دے گی، ہماری حفاظت یہی عوام کرے گی۔ یہی لوگ اپنے آزادی کی حفاظت کریں گے۔ یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ آج ہزاروں میل دور رہ کر لوگوں کو قتل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سوچ وفکر کر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ثبوت بلوچستان کے وہ تمام علاقے ہیں۔ ہم دیکھیں کہ گزشتہ مہنے کلانچ میں قابض ریاست آپریشن کرتا ہے۔ یا کیلکور میں خواتین کو شہید کرتا۔ لیکن اس کے باوجود ہزروں کی تعداد میں عوام جہد کاروں کی حمایت میں میدان میں آتے ہیں۔ یہ عوامی طاقت کے ثبوت ہیں۔ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ ٹیکنالوجی کا استعمال کررہے ہیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ ٹیکنالوجی آزادی کے حق میں استعمال ہو۔ اس کے خلاف نہیں۔ چند لوگ سوشل میڈیا میں بلوچ لیڈران کے خلاف مختلف پروپیگنڈے کرتے ہیں۔ ہمارے لیڈر بانک کریمہ بلوچ کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ بانک کریمہ بلوچ قوم کے لیڈر ہیں بی ایس او کے لیڈر ہیں، وہ عوام کے اندر موجود ہے۔ شہید رضا جہانگیر شہید ہوتے ہیں، چیئرمین زاھد جان اغواء ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود بانک کریمہ بی ایس او کو اسی طرح چلاتی ہیں۔ جس اتحاد کو زاہد جان نے برقرار رکھا بانک کریمہ انہی اتحادیوں کو لیکر چل رہی ہیں۔ اس اتحاد کو چیئرمین خلیل اور ڈاکٹر منان بلوچ نے برقرار رکھا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ضرور بی آر پی کے دوست بھی اس اتحاد کو برقرار رکھیں گے۔ عوام آزادی و یکجہتی چاہتی ہے۔ آزادی اتحاد سے ہی ممکن ہے۔ اور ایک بات میں کہنا چاہتا ہوں کہ اتحاد آزادی کے پوائنٹ پر متفق پارٹیوں سے ہی ہوسکتی ہے۔ بی این پی اور نیشنل پارٹی پاکستان نواز پارٹی ہیں، جس طرح ہمیں پاکستان سے نفرت ہے اسی طرح ہمیں پاکستان نواز پارٹیوں سے بھی نفرت ہے۔ مجھے خوشی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ جب جدوجہد شروع ہوتی ہے تو چند نام جو بہت عظیم ہوتے ہیں، ان میں شہید حمید جان بھی ایک ہیں۔ جو اسی زمین کے ایک بہادر ماں کے بیٹے ہیں، جب مسقط حکومت ظفاریوں کے قتل عام کے لئے پاکستان کی ایماء پر بلوچ نوجوانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرتا ہے تو شہید حمید جان اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ کہ ہم خود محکوم ہیں، ہم کیوں ظفاریوں کو ماریں، وہ بھرتی کرنے والے آفیسر کو اپنے ہی ہاتھوں سے گولی کا نشانہ بناتے ہیں۔ سد حیف اُن پر جو حمید بلوچ کی خون کا سودا کر کے پاکستان کی بیوروکریسی میں بیٹھ کر پالیسی دے رہے ہیں کہ کس طرح بلوچ تحریک کا راستہ روکیں۔ جان محمد دشتی جیسے لوگ پاکستان کے ان اداروں میں شامل ہیں جہاں بلوچ نسل کشی کے لئے پالیسیاں تیار کی جاتی ہیں۔ ہم ان سے کہنا چاہتے ہیں کہ یہ تمہارا علم نہیں بلکہ شہید حمید جان کا خون ہے جس کا سودا کر کے تم پارلیمنٹ تک پہنچ چکے ہو۔ شہید حمید جان کا خون جلد حساب لے گی، جو بھی آزادی مخالف ہیں ان سے حساب لینے والا اور ان کا احتساب کرنے والا یہی عوام ہو گا۔ جس کے ثبوت پاکستان کے گزشتہ الیکشنز ہیں۔ کہ ڈاکٹر مالک کے لئے 500 ووٹ بھی نہیں ڈالے گئے۔ لیکن اس کے باوجود اسے بلوچستان کا کٹھ پتلی وزیر اعلیٰ بنایا جاتا ہے۔ اسے بلوچ عوام کی نہیں بلکہ آئی ایس آئی و پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی حمایت حاصل ہے۔ بی ایس او کے ایک زمہ دار کی حیثیت سے مجھ پر یہ فرض ہے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ کل ان لوگوں نے ہم سے کہا ووٹ کی ضرورت ہے، یہی لوگ بلوچ عوام کا خون کر کے پارلیمنٹ تک پہنچے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بلوچ عوام اب تک سلامت ہیں، بلوچ سرزمین کی حفاظت کرنے والے بہت ہیں۔ یہ سرزمین جہاں حمید جان جیسے بہادر، مراد ساحر اور غلام حسین شوہاز جیسے زانتکار پیدا ہوئے ہیں، یہ انہی کی سرزمین ہے۔ یہاں کے عوام جس طرح آج اس جہد کے ہمراہ ہیں، منزل تک یونہی ہمراہ رہینگے۔ اس کا ثبوت ہے کہ پاکستانی پروپیگنڈوں کے باوجود چند دنوں میں ہی بی این ایف کے جلسے میں ہزاروں کی تعداد میں بلوچ عوام نے شرکت کر کے کامیاب بنایا۔ میں انہیں مبارک باد دیتا ہوں، بلکہ انہوں نے اپنا فرض سمجھ کر اس دیوان کو کامیاب بنایا ہے،

ایک بات میں کہتا ہوں کہ آزادی کے لئے اپنے اندر جذبہ پیدا کریں، تو پھر ہمیں کوئی نہیں روک سکتا، جذبہ ہمیں پیدا کرنا ہو گا۔ کیونکہ ہم آزادی اور انقلاب دوست ہیں۔ بقول چیئرمین بلوچ خان کے دنیا میں ہر محکوم اور ہر شہید ہمارا سنگت اور ہمراہ ہے۔ دنیا کے تمام محکوم ومظلوم قوموں کے جدوجہد کو ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق انکی حمایت بھی کرتے ہیں۔ اپنی آزادی کے بعد بھی ہم ضرور مظلوم قوموں کی جدوجہد کا حصّہ بن جائیں گے۔ منت وار

پاکستان مردہ باد

انقلاب زندہ باد

☆☆☆

زاھد بلوچ جو ریاستی خفیہ اداروں کے ھاتھوں قید ھے وہ بلوچ قوم کو منظم پارٹی اور تنظیم دینے کی خواھش رکھتا تھا۔

﴿جلسہ عام بنام شہید رضا جہانگیر و شہید امداد بجیر دشت بلنگور میں جلسہ عام سے ڈاکٹر منان بلوچ کا خطاب﴾

میرے لیئے یہ باعث فخر ہے کہ آج میں اس سرزمین پر کھڑا ہوں کہ جو بلوچی ادب و سیاسی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ غلام حسین شوہاز، مراد ساحر، ڈاکٹر ناگمان اور عصا بجار جیسے لوگ اس زمین پر پیدا ہوئے ہیں ۔پھلین حمید یہیں کُنچتی دشت میں پیدا ہوئے ہیں شہید حمید شاید دنیا کا پہلا عظیم بہادر انسان نہ ہو مگر دنیا میں شہید حمید جان کا نام بھی دنیا کے دیگر بہادر انسانوں کے ہمراہ صفحہ اول پر لکھا جائے گا ۔شہید حمید بلوچ کے بارے میں انکے پھانسی دینے والے (جلاّد) کا یہ خود کہنا ہے کہ میں نے پہلی بار ایک ایسے شخص کو دیکھا جو پھانسی کے پھندے کو چھوم کر اور اپنے وطن کا نام لے کر اسے گلے لگاتا ہے اپنے وصیت نامے میں شہید حمید کہتے ہیں کہ میری تین سالہ بانڑی کے زمانے میں انکے بیٹوں کے زمانے میں یا انکے بعد ایک روز ضرور یہ خبر مل جائے گی کہ وہ آزاد ہیں۔ مبارک ہو آپ کو شہید حمید جان کہ آج آپ کے کئی بانڑی اور مائیں آپ کے جہد کے ہمراہ یہاں موجود ہیں جان محمد دشتی جیسے گماشتے جو کہ آپ کے خون کا سودا کر رہے تھے لیکن بلوچ ماں بہنوں نے آج انکو بے نقاب کر دیا ،آج یہ ہزاروں کی ہجوم اس بات کا گواہ ہے کہ یہ لوگ آپ کے فکر کے ہمراہ ہیں آج کے دن کہ شہید رضا اور شہید امداد سمیت وہ دوست جو اگست میں شہید ہوئے ہیں ان میں ڈاکٹر خالد شہید اکبر خان ،شہید دل جان شہداد سمیت کئی دوست اگست کے مہینے میں شہید ہو چکے ہیں۔

میرے بہنو، بھائیو اور دوستو!

آج آپ لوگوں کا یہاں بیٹھنا سورج کی گرمی کو تحمل سے برداشت کرنا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ آزادی تک آپ لوگوں کا یہ صبر اور جدوجہد جاری رہیگا، گوکپر وش جو کہ تربت کے قریب ہے مرگاپ اور گوکپر وش قریب قریب ہیں ان کا بلوچ تاریخ میں اپنا ایک مقام ہے، گوکپر وش میں بلوچ خان نوشیرانی انگریز قابضین سے لڑ کر شہادت نوش کرتے ہیں اور مرگاپ میں شہید غلام محمد بلوچ لالا منیر اور شیر محمد بلوچ کی لاشوں کو مسخ کر کے پھینک دیا جاتا ہے دیگر بہت سے جہدکاروں کی لاشوں کو بھی وہاں پھینک دیا جاتا ہے۔ دشت میں مشرف دور حکومت میں وہ لوگ جو قوم پرستی کے نام پر قوم کو دھوکہ دے رہے تھے جن میں ڈاکٹر مالک ،اختر مینگل اور بہت سے گماشتے گوادر میں ترقی کے نام پر بلوچ قوم کا استحصال کرتے ہیں اور میرانی ڈیم تعمیر کر کے وہ حقیقت میں دشت کو ایک vert bay سٹی کے نام پر محدود آبادیوں پر تقسیم کرنا چاہتے تھے کہ وہاں تمام تر سہولتیں ہونگی لیکن بلوچ قوم کیلئے نہیں حاکموں کیلئے ہونگے آرمی کیلئے اور پنجابیوں کیلئے ہوں گے۔ صد سلام ان جہدکاروں کو جنہوں نے اس سازش کو بھانپ کر اس کو ناکام بنا دیا ،آج پورے دشت کے عوام اپنے مستقبل اور آزادی کی جنگ کے ہمراہ ہیں میں اس بات سے متفق ہوں کہ آپ جیسے لوگوں کی شراکت اور ہمرداری سے ہی ہم قومی نجات حاصل کریں گے، عوامی طاقت سے اپنی بہادر ماں بہنوں کے ساتھ ملکر شہید زاہد بلوچ کے والدین جیسے والدین کی ہمرداری سے بلوچ اپنی گلزمین کی آزاد حاصل کرے گی۔

میں اس جلسے میں بی ایس او آزاد کے چیرمین زاہد بلوچ کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہا ہوں زاہد بلوچ اسٹیج پر ہمیشہ بات کرتا تھا اس کی کڑوی حقیقت والے الفاظ اٹیم بم سے زیادہ طاقت وار اور جاندار ہوتے تھے اور انکی بات دشمن کو تکلیف دیتی تھی۔ زاہد بلوچ شعوری و علمی بات کرتا تھا اسکی زہانت انکی محبت بلوچ قوم اور گلزمین سے وابستہ ہے۔ زاہد بلوچ میں سچ بولنے بے باک ہونے تنقید کرنے کی صلاحیت موجود ہے،

زاہد بلوچ جو ریاستی خفیہ اداروں کے ہاتھوں قید ہے وہ بلوچ قوم کو منظّم پارٹی اور تنظیم دینے کی خواہش رکھتا تھا انکی کمی کو مجھ سمیت پوری قوم محسوس کر رہی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ زاہد بلوچ کا کاروان انکے ریاستی اغوا کے باوجود رواں دواں ہے۔ زاہد بلوچ کا فکر اور عمل آج بھی ہماری رہبری کر رہا ہے، مجھے یقین ہے کہ عوامی طاقت سے ایک دن پھر زاہد بلوچ ہمارے درمیان موجود ہونگے انکے علمی گفتگو پھر ہماری رہبری کریں گے، بلوچ ایک عظیم سرزمین کا وارث ہے جسکے وسیع و عریض میدان، دشت و بیابان، پہاڑ اور دریا اور ساحل کی لمبائی اور چوڑائی وسیع اور عریض ہیں۔ بلوچستان ہمیں تحفے میں نہیں بلکہ قربانیوں کے ایک تسلسل کے بعد ملا ہے۔ بلوچستان کو پُرتگیزی، ایرانی، عرب، افغانی، انگریز سب قبضہ کرنا چاہتے تھے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ ہماری

سرزمین کی جغرافیائی اہمیت موجود ہے۔اسی اہمیت کی وجہ سے پہلے قبضہ کرنے کی کوشش کی گئی۔آج میں ان تما م ان فرزندوں کو سلام پیش کرتا ہوں جنہوں نے سر زمین کی دفاع کی خاطر اپنی جانوں کا نذارنہ پیش کیا ۔شہید نواب اکبر خان بگٹی عزیز بگٹی کے کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ مغلوں نے ہندوستان فتح کیا سوری نے ہندوستان فتح کیا اور دیگر بہت سے قبضہ گیروں نے سرزمین قبضہ کی اور آج ان قوام کی کوئی نشان باقی نھیں۔بلوچ نے کسی کی سرزمین پر قبضہ نھیں کیا مگر آج بھی اپنی سرزمین کی دفاع میں مصروف عمل ہے اور آج بھی وجود رکھتا ہے میں نواب صاحب کی اس بات سے متفق ہوں ،بلوچ قوم آج بھی بہ فخر ہے کہ زمین ،زبان،ثقافت،تاریخ وسائل،محبت اور معیار سب کچھ ملا ہے مگر آج بدقسمتی سے ہم ایک ایسے ملک کے غلام ہیں جسکے لوگ خود نہیں جانتے کہ وہ کیسے معرض وجود میں آئے۔آج اسلام آباد میں کوئی نہیں جانتا کہ کس کی حکمرانی ہے طاہر القادری انقلاب اور عمران خان اصلا حات کے نام پر دھرنا دیئے بیٹھے ہیں اور دوسری طرف فوج۔کسی کو یہ پتہ نھیں چلتا کہ اس ملک میں کس کی حکمرانی اور حاکمیت ہے پاکستانی دانشور خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان میں نہ صرف معاشی اور سیا سی بحران ہے بلکہ یہاں اخلاقی اور معاشرتی بحران بھی ہے پاکستان کی اخلاقیات بومی بٹ اور گلو بٹ پر آ کر رک چکا ہے۔آج وہ ایک دوسرے کو بومی بٹ اور گلو بٹ کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔وہ ایک دوسرے پر انہی ناموں سے الزام تراشی کرتے ہیں۔اگر آپ کو اخلاقیات سیکھنا ہے تو آ کر بلوچ ماؤں سے سیکھو، بلوچ بہنوں، بزرگوں اور آزادی پسندوں سے سیکھو،ان میں کتنی بڑی شعور جذبہ قربانی، برداشت تحمل فکر اور سنجیدگی ہے۔بی این ایف کے جلسے میں علمائے کرام بیٹھے ہوں گے، اگر نہیں بھی ہونگے تو میں ان سے بھی مخاطب ہوکر کہتا ہوں کہ وہ اپنا فرض جان کر یہ کردار ادا کریں کہ اسلام برابری کا درس دیتا ہے۔آپ علمائے کرام قومی تحریک میں ایک مثبت کردار ادا کریں۔کیا مذہبی اجتماعات میں پاکستان فوج کے لئے دعائیں مانگنا اسلام سے محبت ہے؟ پاکستانی فوج 1969 میں مذہبی شدت پسندی کو ابھار کر سامنے لاتی ہے،اور آج اسی جگہ پر ضرب عزب کے نام سے بمباری کر رہا ہے،اور عام لوگوں کا قتل کر رہا ہے۔آیا اسلام کے تقاضے یہی ہیں؟ اسلام ایک تقدس اور سچائی کا نام ہے،اپنی آزادی کے لئے لڑنے کا درس دیتا ہے۔کیونکہ غلامی انسانیت نہیں۔پیغمبر اور صحابہ کرام نے جہاں کہیں بھی انسانیت کو ذلیل ہوتے دیکھا اس کے خلاف جنگ کی۔یہ ہم پر بھی فرض ہے کہ اپنی آزادی اور سرزمین کے لئے لڑیں۔اور بلوچ علمائے کرام کی یہ قومی ذمہ داری ہے کہ وہ جمعہ اور عید کے خطبوں میں پاکستان کے بجائے قومی آزادی کے جُہد کاروں کے لئے دعا کریں۔کیونکہ بلوچ جہد کاروں کی مضبوطی میں انسانیت کی مضبوطی و بقاء ہے۔آج اسلام کے نام پر بلوچ خواتین پر تیزاب پھینکا جا رہا ہے۔کیا اسلام میں خواتین پر تشدد جائز ہے؟ جس دن رسول ﷺ اپنا پہلا خطبہ دیتے ہیں تو سب سے پہلے خواتین کو احترام دینے کا درس دیتے ہیں۔ہندہ جو کہ حضرت حمزہ کو شہید کروانے کے بعد انکے کلیجے چبھاتی ہے اس کے باوجود حضرت محمد ﷺ اسے معاف کر دیتے ہیں۔چند گماشتے جو اس پاکستان سے امید لگائے بیٹھے ہیں جو خود اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہے۔بہت افسوس ہوتا ہے گماشتوں کے ایسے کردار پر۔انہیں چاہئے کہ آج وہ سوچیں، دنیا کے حالات کا جائزہ لیں۔خود پاکستان کے حالات کا جائزہ لیں کہ اسلام آباد میں اخلاقیات کا کیا حال ہے۔دوسری طرف آج مسئلہ فلطین پر پوری دنیا آواز اُٹھا رہی ہے ہمیں فلسطین میں حملون کے نتیجے میں مرنے والے انسانون سے ہمدردی ہے،لیکن ہمیں افسوس اس بات پر ہو رہا ہے کہ 1948 سے لیکر اب تک بلوچ ان جیسی حالات سے گزر رہے ہیں لیکن دنیا اس حوالے سے آواز اُٹھانے کو اپنا فرض نہیں سمجھتی۔ظلم جہاں کہیں بھی ہو وہ ظلم ہی ہے، چاہے کیپٹلزم کے نام پر ہو، سوشلزم کے نام پر یا مذہب کے نام پر ہو۔لہٰذا وہ لوگ جو یورپ و امریکہ سمیت جہاں کہیں بھی رہتے ہوں وہ فلسطین کے حق میں مظاہرے کرتے ہیں ان سے امید رکھتا ہوں کہ وہ بلوچ کے حق میں بھی آواز اُٹھائیں گے۔آج پاکستان کے وجود کی وجہ سے پوری دنیا بدامنی و عدم استحکام کا شکار ہے۔دنیا میں مذہب کے نام پر جہاں کہیں بھی تقسیم ہو رہا ہے ہم اس کی مذمت کرتے ہیں۔آج بلوچستان میں ایسا کوئی کوچہ و ھگ نہیں جو پاکستان فوج کی ظلم و بربریت سے محفوظ ہو۔کیل کور، مشکے ، ناصر آباد، اسپلنجی سمیت پورے بلوچستان میں خواتین و بچوں پر تشدد کر کے انہیں شہید کیا جا رہا ہے،ہم دنیا کے مہذب عوام سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی حکومتوں کے خلاف پاکستانی فوج کو امداد دینے پر آواز اُٹھائیں سعودی عرب جہاں حضرت محمد ﷺ پیدا ہوئے ہیں ۔ جہاں سے پیغام امن کو پوری دنیا میں پھیلایا گیا۔لیکن آج سعودی حکومت اربوں روپے دیکر پاکستانی فوج کو مضبوط کر رہی ہے۔سعودی عرب کو جاننا چاہیے اور دنیا کو بلوچ قوم پر ہونے والے جبر پر آواز اُٹھانا چاہیے۔

☆☆☆

وہ جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو کر پروپیگنڈہ کرتے ہیں وہ نظریاتی نہیں بلکہ لالچی ہیں۔

دشت میں بی این ایف کے جلسہ عام سے لطیف جوہر کا خطاب

قاضی پہ ڈیہہ ءِ ھاترءَ پاہو چہ سُہرءَ شرترانت
باریں کئی بھت ءَ کپ اِیت اے سادماں لنجیں
شپاں

جدوجُہد کے رہنماؤ، میری ماؤں، بہنو اور بھائیو!

بی این ایف کے سکریٹری ڈاکٹر منان بلوچ، کمال بلوچ، شہید زاہد جان کے بزرگ والد، بی آر پی کے دوست، بلوچ جہد میں سرخرو رہو،

آج کا یہ دیوان میرے اس عظیم دوست اور رہنماء کہ جنہوں نے مجھ جیسے ایک ناسرپد کی رہنمائی کی اور اپنے تنظیم میں شامل کیا، اور مجھے اس مقام تک پہنچایا کہ دنیا کے عوام اور میرے اپنے لوگ مجھ سے آشنا ہوئے ہیں۔ میرے اُس عظیم دوست کہ جس کی پرورش میں، میں نے چھ 6 سال گزارے وہ شہید رضا جہانگیر بلوچ ہیں۔ وہ تمام شہدا ہیں کہ انہوں نے اپنے قومی مستقبل کے لئے اپنی خوشیاں قربان کی ہیں۔ ان کی قربانیوں سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ وہی نام اور پہچان ہے کہ آج ہم یہاں پر اکھٹے ہوسکے ہیں۔ جدوجہد کی کامیابی کے لئے میرا تعلق بی ایس او سے ہے، بی ایس او کیا ہے۔ کیا آپ کو خبر ہے کہ بی ایس او نے کونسی اچھائیاں متعارف کی ہیں اور کونسی برائیوں کا خاتمہ کیا ہے؟ بی ایس او کے کارنامے آج تمہارے اور ہمارے سامنے ہیں۔ بی ایس او نے سرداریت اور نوابیت کا خاتمہ کردیا وہ سردار و نواب جنہوں نے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر قوم کو تقسیم در تقسیم کا شکار کیا۔ ہماری وہ طاقت کہ جس کے سامنے امریکہ جیسی قوتیں بھی گھٹنے ٹیک دیں، ان نوابوں نے اسے جہالت تقسیم اور ذہنی پسماندگی کا شکار کرکے محدود کردیا۔ وہ نواب اور سردار جنہوں نے قوم پرستی کے نام پر قوم کو اپنا سجدہ کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن بی ایس او نے آج یہ برائیاں ختم کی ہیں۔ اور اس تحریک کو شہید رضا جہانگیر جیسے عظیم لیڈران عطاء کیئے ہیں۔ ہم جس معاشرے میں پلے بڑے ہیں، وہاں پر بلوچ و بلوچیت کے نام کو مٹانے کی کوشش ہوئی ہے۔ وہاں پر پاکستان کی گود میں پرورش پانے والے ایک عالمی منشیات فروش امام بھیل کو دشمن نے اپنے مفادات کیلئے کھلی چھوٹ دی ہے۔ تاکہ وہ بلوچ نوجوانوں کو منشیات کی لعنت میں گرفتار کرکے انکی ذہنوں کو مفلوج کرے۔ کیونکہ جب ایک شخص ذہن پسماندگی سے نکل جائے تو وہ تمام نیکی و بدی میں تمیز کرکے ترقی کرسکتا ہے۔ آج ٹیکنالوجی کے جس جدید ترین چیزوں کو ہم استعمال کررہے ہیں تو وہ دنیا کے روشن خیال ذہنوں کی ایجادات ہیں۔ لیکن دشمن ہمارے نوجوانوں کی سوچ اور ذہن کو مفلوج کرتی ہے تاکہ ہم اپنی قومی سوچ سے بیگانہ ہوجائیں، ان لوگوں نے ہمیں متحد ہونے نہ دیا، سوچنے سمجھنے اور فرق کرنے نہیں دیا، لیکن رضا جہانگیر جیسے نوجوانوں نے انکے سامنے حرف انکار بلند کرکے مجھ جیسوں کی تربیت کی۔ میں 46 روز تک بھوک سہہ سکتا ہوں، یہ میں نہیں بلکہ بی ایس او آزاد، بانک کریمہ، رضا جہانگیر، چیئرمین بلوخان اور اُن جُہد کاروں کی دی ہوئی ہمت ہے کہ آج وہ اپنی تمام تر خواہشات قربان کرنے پر راضی ہیں۔ ہم مایوس نہیں، ہم نے جو سیکھا ہے ان سے ہم میں برداشت پیدا ہوئی ہے کہ اس جدوجہد کو مستقل مزاجی، مسلسل جہد، اور برداشت سے منزل تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ یہ ایک طویل جدوجہد ہے اور اس شرط پر کامیابی سے ہمکنار ہوگی کہ ہم اپنے دشمن کو منتشر کرکے بھگائیں۔ آج ڈاکٹر مالک صاحب کہتے ہیں کہ میں تعلیم کی بہتری کے لئے کام کررہا ہوں لیکن یہ آپ کے سامنے ہے کہ مکران کے بڑے تعلیمی اداروں کو بند کردیتا ہے۔ مالک ایک کٹھ پتلی ہے، جو کرتا ہے وہ ریاست کرتا ہے، میں آپ سے کہتا ہوں کہ ایسا نہ ہو کہ ہم دو گھنٹے کے لئے آئے ہیں، یا جذباتی ہوکر آئے ہیں۔ ہمیں اپنے جذبے کو برداشت اور قومی نظریے میں بدلنا ہوگا۔ تو ہم اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ وہ جنہیں ہم سرخ سلام پیش کرتے ہیں وہ آرام سے نہیں بیٹھے بلکہ انہوں نے برداشت اور فکری حوالے سے اپنے آپ کو

قربان کیا ہے کہ آج وہ ہمارے اور آپ کے سامنے سرخرو ہیں۔

کچھ لوگ جو جہد کاروں کو چند افراد کہتے ہیں، تو ان کے لئے مجھے بھگت سنگھ کا ایک قول یاد آرہا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی ادارہ بناتا ہے۔ آج بھگت سنگھ جیسے لوگ میرے اپنے قوم میں ہیں، وہ بابا مری ہیں کہ جنہوں نے تمام زندگی قربان کی، وہ بانک کریمہ کی شکل میں ہیں، رضا جہانگیر کی شکل میں ہیں، ہمارے معاشرے میں جہاں گھریلو معاملات سنبھالنے تک محدود کردیا گیا ہے جو دشمن کی طرف سے مسلط کردہ نفسیات ہے، بانک کریمہ نے عورت ہونے کے باوجود جدوجہد میں حصہ لیکر دشمن کے اس چال کو ناکام بنادیا ہے۔۔ یہ ایک جدوجہد ہے اس کی طاقت عوام ہے۔ پہلے یہاں پر سردار اور نواب تھے۔ ان کی طاقت کون تھی؟ انہیں کسی دیومالائی قوت کا سہارا حاصل نہ تھا، بلکہ ان کے پیچھے بندوق ہم اور آپ اُٹھائے ہوئے تھے۔ یہ جو پارلیمنٹ تک پہنچے ہیں ان کو بھی پہنچانے والے ہم اور آپ رہے ہیں۔ کیونکہ ہم ریاستی چالوں کو سمجھنے میں ناکام رہے تھے، لیکن آج جدوجہد نے سرداروں اور نوابوں کی پوجا کے بجائے قوم کے پوجا کی درس دی ہے۔ آج ہم اور آپ یہاں نہ اللہ نذر کے لئے بیٹھے ہیں اور نہ ہی خیر بخش مری کے لئے، بلکہ ہم قوم کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اس سے پہلے ہمارا کوئی مقصد نہیں تھا، ہماری نسلیں اور زندگیاں تباہ ہورہی تھیں، وہ حکمت عملیاں جو کہ ہماری بربادی کے لئے بنائی گئی ہیں، ہم ان کے شکار رہے ہیں۔ دشمن کی آشیرباد سے پارلیمنٹ تک جانے والے لوگوں نے نوجوانوں کیلئے تعلیمی اداروں کو بند کیا ہے۔ یہ ڈاکٹر مالک نہیں بلکہ وہ دشمن ہے جس نے داکٹر مالک جیسوں کو وہاں تک پہنچایا ہے۔ ہمیں ان کو جاننا ہے۔ قربانی صرف مرنے کا نام نہیں بلکہ اپنی زندگی کی تمام خوشیوں کو قربان کرنے کا نام ہے۔ اگر کوئی اپنی خوشیاں قربان نہ کرے تو صرف جان کی قربانی کو قربانی نہیں کہا جاسکتا۔ ہمیں اور آپ کو اگر کچھ کرنا ہے تو اپنی زندگی میں ہی کرنا ہے۔ ہمیں بار بار مرنے کے بجائے شعوری طور قربانی دینا چاہیے۔ تاکہ ہمارا مستقبل ہمیں یاد رکھے، اگر نہیں تو ہم کب سے بھوک افلاس اور غربت کا شکار ہوکر مر رہے ہیں۔

مجھے لوگوں نے کہا آپ کیوں خودکشی کرر ہے ہو۔ مین اسے خودکشی کا نام نہیں دے سکتا، کیونکہ میری طرح کے ہزاروں دوست اس راہ پر قربان ہوچکے ہیں، جیسے زاہد جان جنہیں چند ماہ پہلے شال سے دشمن نے اٹھا کر غائب کردیا۔ ہمیں ان تمام چیزوں کو جاننا ہے، دشت میں پیدا ہونے والے حمید جو کہ پھندے کو چھوم کر گلے میں ڈالتے ہیں، آج وہ نام دار ہے کہ دشت کا سودا کرنے والے؟ مجید اول جو بھٹو کو تباہ کرنے کے لئے اپنے سینے پر بم باندھ کر قربان ہو جاتے ہیں، لیکن آج تک وہ زندہ ہیں۔ یہ میرا ایمان ہیکہ اگر پورے بلوچستان میں ایک ہزار نوجوان اخلاقی حوالے سے قربان ہونے پر تیار ہوجائیں۔ تو اس دشمن میں اتنی سکت نہیں کہ اس کے کرائے کے سپاہی ہمارے شعوری جدوجہد کا راستہ روکیں۔ اگر جذبے کو ایک پارٹی کی رہنمائی اور ماں کے حوصلے کا ساتھ ہو تو منزل تک پہنچا جاسکتا ہے۔ ہمارے دشمن کی دشت میں تعداد کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ ہماری خاموشی اور بے عملی ہی دشمن کی طاقت ہے۔ اگر واقعتاً شہدا کیلئے ہم میں ہمدردی ہے تو ہمیں عمل کرنا ہوگا۔ دشمن کے تمام پالیسیوں کو ناکام کرنا ہوگا، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جلسوں کا کوئی فائدہ نہیں میں جانتا ہوں کہ دس ہزاروں لوگوں کے اجتماع کی کیا اہمیت ہے۔ وہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ عوام جہد کاروں کے ہمراہ نہیں وہ اس جلسے کے ویڈیوز دیکھ کر ضرور مان جائیں گے کہ عوام بی ایس او کے ہمراہ ہیں۔ بلکہ قوم بی این ایف اور بی آر پی کے ساتھ ہے۔ آپ بہتر جانتے ہیں کہ منشیات کیسی لعنت ہے۔ ایک ماں جس کی کوئی اولاد نہ ہو، دعاءِ خیرات کے بعد اگر اس کے ہاں کوئی

> واجہ میر محمد علی ٹالپر کی ایک بات جو مجھے یاد آرہی ہے کہ نظریاتی اور فکری سنگت لالچ کا شکار نہیں ہونگے، وہ جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو کر پروپیگنڈہ کرتے ہیں وہ نظریاتی نہیں بلکہ لالچی ہیں۔ ہمیں اور آپکو فکری حوالے سے جدوجہد کا ہمراہ ہونا ہوگا۔ تاکہ جدوجہد اپنی منزل تک پہنچ جائے۔ اگر خدانخواستہ ہم نے اس جدوجہد کا ساتھ چھوڑ دیا تو ہم اپنی زندگیوں کو چھوڑ رہے ہیں۔

اولاد پیدا ہو، وہ اس بیٹے کو اپنی زندگی کا سہارا بنانے کی آس میں اس کی پرورش کرتی ہے۔لیکن اگر اسی نوجوان کو منشیات کا عادی بنایا جاتا ہو،تو اس ماں کے جذبات کیا ہوں گے۔منشیات یہاں سے ختم ہوئی ہے کیا یہ ایک بڑا کارنامہ نہیں ہے،،؟اس نوجوان کو بی ایس او یہ درس دیتا ہے کہ وہ جا کر پڑھے،لیکن پاکستان اس کے اسکول کو بند کر دیتا ہے۔کیا امام بھیل نے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہے؟ مجھے اور آپ کو مذہب اور ذکر و نماز کے نام پر لڑانے کی کوشش کی جارہی ہے، میں کہتا ہوں کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ دشمن کی پیدا کی ہوئی سازشیں ہیں۔تاکہ میں اور آپ منتشر ہوجائیں۔اور یہ قوت ختم ہو جائے۔یہی ریاست لوگوں کو روزہ رکھنے نہیں دیتی، یہی ریاست یہاں گوادر میں ہمارا استحصال کررہا ہے،آیا وہاں پر عوام کو تنگ کرنا اسلام ہے۔ایران جو کہ سرمچار دادشاہ کے خلاف کاروائی کرتا ہے،اسے شہید کرتا ہے۔یہ تمام سازشیں ہیں۔ہمیں اور آپ کو یہ اس وقت سمجھ میں آئیں گے جب ہم اپنی ذہنی پسماندگیوں سے نکل جائیں۔اور اس نیت پر جُہد کے ہمراہ ہوں کہ ہم اپنے قوم کے لئے لڑ رہے ہیں۔واجہ میر محمد علی ٹالپر کی ایک بات جو مجھے یاد آرہی ہے کہ نظریاتی اور فکری سنگت لالچ کا شکار نہیں ہونگے،وہ جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو کر پروپیگنڈہ کرتے ہیں وہ نظریاتی نہیں بلکہ لالچی ہیں۔ہمیں اور آپکو فکری حوالے سے جدوجہد کا ہمراہ ہونا ہو گا۔تاکہ جدوجہد اپنی منزل تک پہنچ جائے۔اگر خدا نخواستہ ہم نے اس جدوجہد کا ساتھ چھوڑ دیا تو ہم اپنی زندگیوں کو چھوڑ رہے ہیں۔آج جو ہم یہاں بیٹھے ہیں، اپنے اس جذبے کو ہمیں صبر کا تابع بنانا ہوگا۔اگر دس سال۔بیس سال لگیں گے تو بھی ہم اس جہد کے ساتھ رہیں۔میں نے بھوک ہڑتال برداشت کی ہے۔انشااللہ آئندہ بھی اپنی تنظیم کی پالیسی کے تحت اپنے لیڈر کیلئے ہر قربانی کیلئے تیار ہوں کہ اس نے ایسے حالات میں بلوچ اسٹوڈنٹس کی رہنمائی کی ہے۔انکے اپنے دوست حالات کی سختی کی وجہ سے خلیج و یورپ چلے گئے،لیکن انہوں نے رضا جہانگیر، بانک کریمہ، اور اپنے دوسرے فکری ساتھیوں کے ہمراہ اس جدوجہد کو ایک نئی شکل دی ہے کہ آج ہزاروں لوگ جمع ہونے پر تیار ہیں۔یہ زاہد کی مستقل مزاجی ہے،یہ اس کی برداشت ، بی این ایم اور دوسری پارٹیوں کے برداشت سے ممکن ہوا ہے۔ اگر ہم قومی اتحاد و یکجہتی کی بات کرتے ہیں تو ہمیں اس کاروان کا ہمراہ ہونا ہوگا۔وگرنہ اس جدوجہد سے پہلے ہم کہاں تھے۔اور سوچ کیا تھی۔۔۔۔میں دنیا سے کہنا چاہتا ہوں کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ انہوں نے ہمیں دھوکہ دیا ہے یہ خاموش ہو جائیں گے،جی نا۔ہم سیاسی لوگ ہیں ،ہم اپنی قوم اور زمینی حالات کو دیکھتے ہیں۔وہ استاد کہ جنہوں نے ہمیں آجوئی کا الف ب پڑھایا ہے،وہ استاد کہ چالیس سالوں سے محاز پر ہے، یہ ہڑتال ان کی گزارش پر ہم نے ختم کی ہے۔یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ عالمی اداروں کا اپنا ایک کردار ہے۔میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ تاوقتیکہ بلوچ آبادیوں پر بمباری کو نہیں روکا جا سکے گا، بی ایس او، بی این ایم اور آزادی پسند ہر ورکر آج بھی بیٹھا ہے اور کل بھی بیٹھے گا۔اور امید ہیکہ یہ تالیاں صرف تسلی کے لئے نہیں ہوں گی، یہ تالیاں ایک برداشت کے لئے ہوں گی،وہ برداشت جو دنیا کے ہر قسم کے تکالیف سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ دے۔یہ برداشت آپ کو پیدا کرنا ہوگا۔اگر سو سال بعد بھی آزادی ملے ہم خود ہمراہ ہونگے، ہمارے بیٹے اپنی آنیوالی نسل کو تربیت کریں گے۔ہمیں دشمن کی حکمت عملیوں کو جاننا ہو گا۔تو پھر ہم اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔جب تک ہم غلام ہیں دنیا کی نظروں میں ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔ہم اور تم جب ائیر پورٹ جاتے تو پاکستانی شناخت کی وجہ سے ہماری تذلیل ہوتی۔لیکن آج بلوچ جُہد کاروں کی وجہ سے ہمیں اپنا ایک قابل فخر پہچان ملا ہے۔ہمیں اور آپ لوگوں کو یہ جدوجہد آگے بڑھانا ہوگا۔ جہاں سے بالاچ، شئے مرید، غلام محمد اور ساتھیوں نے ہمیں چھوڑا ہے۔گا۔مجھے امید ہے کہ یہ صرف ایک جلسہ نہیں ہوگا۔بلکہ آزادی تک ساتھ رہنے والا ایک حوصلہ ہوگا۔منت وار !میرے لیڈران بیٹھے ہیں وہ آپ سے خطاب کریں گے۔

☆☆☆

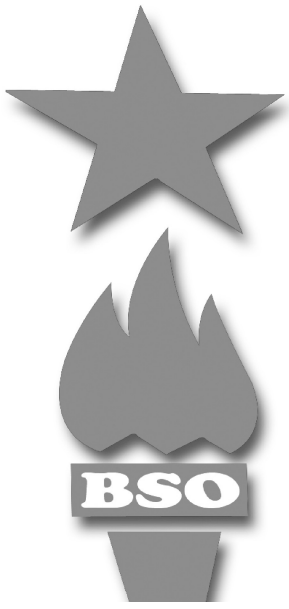

بلوچ تحریک آزادی کو مذہبی انتہا پسندی کی جانب دھکیلنے کی ناکام کوشش

لکمیر بلوچ

یہ واقعہ جو آواران میں ہوا جو اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے ،جو لوگ شہید ہوئے ہیں یا زخمی ہوئے ہیں یعنی جس پر حملہ کیا گیا یہ آزادی پسند تھے انکا تعلق یا انکے خاندان کا تعلق بی ایس او اور بی این ایم کے ساتھ ہے اور باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ان پر حملہ کیا گیا

بلوچ تحریک آزادی کی شروعات سے لے کر آج تک تحریک کو ہر وقت میں ردانقلابیوں کا سامنا کر پڑھا ہے، ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بلوچ دشمن کیلئے ناقابل برداشت ہوتا جارہا ہے قابض اس کوشش میں بلوچ تحریک آزادی کو مذہبی انتہا پسندی کی جانب دھکیل کر فرقہ واریت کا لیبل لگا کر انٹرنیشنل سطح پر رائے عامہ کو گمراہ کرکے (بلوچ جو نیشنلزم کی بنیاد پر جدوجہد کررہا ہے) آسانی سے کاونٹر کرسکے، حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا بلوچ سرزمین کے حقیقی فرزند ہزاروں سالوں سے اپنی سرزمین پر غیروں (قابض) کی قبضہ گیریت سرزمین کی آزادی کی خاطر جہد باعمل رہے ہیں کوئٹہ، مستونگ سمیت بلوچستان کے دیگر علاقوں میں شعیہ مسلک سے تعلق رکھنے والے ہزارہ قبیلے کے لوگوں کو ٹارگٹ کا نشانہ بنا کر سینکڑوں انسانوں کا مذہب کے نام پر خون بہا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش تھی بلوچ سماج مذہبی جنونیوں پر مشتمل ہے۔ بلوچستان میں جاری بلوچ انسر جنسی جو دنیا کے سامنے قوم پرستی کی بنیاد پر جانا جاتا ہے اس حوالے سے دنیا کو گمراہ کرنے کیلئے اِنہیں مذہبی انتہا پسندی کا نام دے کر اسکے خلاف کام کرنے کیلئے عالمی رائے عامہ تیار کرسکیں اور امریکہ سمیت دنیا سے فوجی و مالی امداد لیکر بلوچ جہد آزادی کو کاونٹر کرکے بلوچ جہد کو بدنام کرسکیں پاکستان اپنی ساری قوت بلوچ جہد آزادی کو زیر کرنے کیلئے استعمال کررہا ہے، ان سارے چیلنجز کے باوجود بلوچ اپنی قوت بازو پر نیشنلزم کے جذبے تحت منزل کی طرف گامزن ہے۔ پاکستان فوج کی جانب طاقت کا بے پناہ استعمال اپنی جگہ لیکن پھر بھی بلوچ کو زیر کرنے کیلئے یہ حربے ناکام رہے ہیں جس میں گرفتاریاں ،اغوا، شہادتیں ،آپریشن گھر بار کی لوٹ مار سمیت جہدکاروں کے اہلخانہ کو ڈرا دھمکا کر جہد آزادی سے دور کرنے کی سازشیں شامل ہیں۔ ان سارے مظالم کے باوجود سامراج پاکستان بلوچ نیشنلزم کے جزبے کو ختم نہ کر سکی ہے بلکہ ہر وہ عمل جو قابض کی جانب سے محکوم بلوچوں کو دبانے کیلئے استعمال کی گئی وہ شدت سے اُبھرتا گیا اب وہ بلوچستان کے مختلف علاقوں میں مذہبی منافرت پھیلانے کی ناکام کوشش کررہی ہے۔

24 ستمبر 2013ء کو جو قدرتی آفت زلزلے کی شکل میں مشکے سے لیکر ڈنڈار تک سینکڑوں انسانی جانوں کے زیاں کا سبب بنا مشکے سے لیکر ڈنڈار تک گاوں کے گاوں ملیامیٹ ہوگئے حتا کہ سر چھپانے کیلئے کوئی سایہ بھی نہ رہا تو بلوچ نے اپنی مدد آپ اپنی بحالی کا کام شروع کیا کیونکہ پاکستانی فوج کیلئے یہ علاقے نوگوایریا تھے وہاں امداد اور بحالی کے نام پر پورے زلزلہ زدہ علاقوں میں فوجی چیک پوسٹیں قائم کرکے آزادی پسندوں کا بائیوڈیٹا اکٹھا کرکے آپریشن شروع کیا جو تاحال جاری ہے۔ عسکری طاقت کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی کاونٹر پالیسیز کو یہاں منتقل کرنے کیلئے اپنی اسپیشل فورس کی تشکیل کی انہیں عوام میں پزیرائی دلانے کیلئے اپنے پرورش کردہ دنیا کی نظروں میں کالعدم مذہبی جماعتوں کے نام نہاد فلاحی اداروں کو متحرک کرکے ان کے ذریعے عوامی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی جسکے درپردہ مقاصد سیکولر بلوچ سماج میں مذہبی شدت پسندی کو ہوا دینا تھا۔ جیسا کہ فلاح انسانیت فاونڈیشن جو حافظ سید کے مذہبی گروہ جماعت الدعوی کا زیلی ونگ ہے۔ انکے کارندوں نے متاثرہ علاقوں میں امداد کے بجائے شدت پسندی کی تعلیم و ترغیب کو فروغ دیا۔ جن کا مقصد بلوچ قوم کو مذہبی بنیاد پر تقسیم کی جانب لے جاکر ایک دوسرے کو دست گریبان کرکے بلوچ قومپرستی کے جذبے کو ختم کرنا ہے۔ بلوچ تاریخ کا اگر جائزہ لیں تو ہزاروں سالوں سے مذہبی رواداری کی بنیاد پر نمازی و ذکری، ہندو اور عیسائی ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی احترام کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ جو قوم پرستی اور وطن دوستی کا واضح ثبوت ہیں۔ جو مائنڈ سٹ ہزاروں سالوں سے بن چکی ہے اسے تبدیل کرنا ان نام نہاد مذہبی گرہوں کی بس کی بات نہیں۔ FIF کے کارندے تمام زلزلہ زدہ علاقوں میں پاک فوج کے حق میں باتیں کرتے تھے اور ہر جگہ مسلمانیت کا پرچار کرکے بلوچ عوام کو آزادی پسندوں کے خلاف ورغلاتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ یہاں جو جنگ جاری ہے یہ کافروں کی جانب سے مسلمانوں کو یعنی پاکستان کو توڑنے کی سازش ہے اور باقائدہ فوج کو رپورٹنگ کرتے تھے جسکی واضح مثال آواران میں ایف آئی ایف کے وہ کارندے ہیں جنہیں بی ایل ایف نے اسلحہ سمیت گرفتار کیا تھا۔ آواران میں FIF کی آمد کے بعد حالات یکسر بدل چکے ہیں یہاں آواران میں باقائدہ ملٹری انٹیلی جنس کے افسر جو پہلے میجر حیدر اور اب عثمان کے نام سے مشہور میر پور کے ایک شہری کے اغواء میں سپریم کورٹ کو مطلوب ہے کی سربراہی میں یہاں اسپیشل فورس تشکیل دی گئی ہے۔ رواں سال جون کے مہینے میں آواران پیرانڈر میں قابض فورسز کی چھاپے کے دوران

ایک سامراجی مذہبی پیشوا جو اس سے پہلے FIF میں کام کرتا تھا فورسز کے ساتھ تھا اور اسی کی نشاندہی پر فورسز لوگوں کو گرفتار کرتے گئے۔ بلوچ جہدآزادی کو کاؤنٹر کرنے کیلئے بلوچ سماج کو فرقہ واریت کی جانب دھکیلنے کے واقعات روز بہ روز شدت اختیار کرتے جارہے ہیں۔حال ہی میں رواں سال رمضان کے آخر میں بلوچستان کے علاقے نال گریشہ میں ذکری فرقے سے تعلق رکھنے والے بلوچ فرزندان جو کوہ مراد زیارت سے واپس آرہے تھے(ہرسال ذکری فرقے کے لوگ شپ برات کی رات کیلئے وہاں جاتے ہیں) پاکستانی تشکیل کردہ سامراجی گروہوں نے گریشہ پنجگور کراس میں نشانہ بنا کر متعدد بلوچوں کو زخمی کردیا۔

28 اگست 2014 کو آواران میں بازار سے دوکلومیٹر دور کہن زیلگ میں واقع سید عیسی کا مزار پر عبادت گاہ میں عبادت کے دوران چوبیس بلوچ فرزندان عبادت میں مصروف تھے کہ عبادت ختم ہونے پر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے تین تربیت یافتہ کارندے جو ایک ہی موٹر سائیکل پر سوار تھے آکر ہی زائرین پر فائر کھول دیا۔سب سے پہلے شہید رضا جہانگیر کے والد بختیار بلوچ کو ٹارگٹ کیا گیا۔ فائرنگ کے بعد بھی زندہ بچ جانے والوں کو اندر داخل ہوکر فوجی انداز میں پوزیشن لے کر برسٹ مارا۔

عبادت خانے کے piller کے پیچھے بہت سے لوگ ڈر کے مارے زمین پر گر پڑتے ہیں اور حملہ آور سمجھتے ہیں کہ یہ سب مر گئے ہیں۔تین حملہ آوروں میں سے ایک باہر کھڑا پہرہ دے رہا تھا جو دونوں کی حفاظت کیلئے کھڑا تھا۔ حملے میں شہید رضا جہانگیر کے ولد محترم بختیار بلوچ، ناکو مزار، 18 سالہ سعید بلوچ، 14 سالہ نیاز بلوچ، 35 سالہ اللہ بخش بلوچ، 30 سالہ داد جان بلوچ اور حاجی ایتان موقع پر جام شہادت نوش کرتے ہیں۔جبکہ 9 دیگر بلوچ فرزند زخمی ہوگئے جنکی حالت انتہائی تشویشناک ہے۔ جب انھیں hospital لے جایا جارہا تھا تو راستے میں ایف سی چیک پوسٹ انہیں روک کر یہ کہا گیا کہ آگے کلیئرنس نہیں ہے کوئی آگے نہیں جاسکتا۔ واقعہ رات 9 بجے پیش آتا ہے مگر کلیئرنس 1 بجے مل جاتی ہے۔واقعہ آواران بازار سے دوکلومیٹر دور جہاں آرمی کیمپ واقع ہے ۔حملہ آوروں کو لوگوں نے واپس جاتے ہوئے ماشی تک اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ماشی کے بعد آرمی کیمپ شروع ہوجاتا ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ حملہ پاکستانی خفیہ وسیکیورٹی اداروں کی جانب سے بلوچوں پر کیا گیا ہے۔دوسرے دن میڈیا میں یہ شوشہ چلتا رہا کہ ذکری فرقے پر حملہ کیا گیا ہے۔اگر حقیقت کا جائزہ لیا جاتے تو یہ ذکری فرقے پر حملہ نھیں بلکہ بلوچ آزادی پسندوں کو تقسیم کرنے کیلئے پاکستانی کارندوں نے کیا ہے۔تاکہ جوش میں آکر بلوچ خود ایک دوسرے پر حملہ آور ہوکر بلوچ قوم میں خانہ جنگی پیدا کریں۔اب ذرا غور کریں ذکری فرقے کے لوگ بلوچستان کے ہر علاقے میں موجود ہیں یہ واقعہ جو آواران میں ہوا جو اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے، جو لوگ شہید ہوئے ہیں یا زخمی ہوئے ہیں یعنی جس پر حملہ کیا گیا یہ آزادی پسند تھے انکا تعلق یا انکے خاندان کا تعلق بی ایس او اور بی این ایم کے ساتھ ہے اور باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ان پر حملہ کیا گیا۔ دوسری طرف پیدارک میں اپنے زرخرید ایجنٹوں کے ذریعے وہاں پر اسی روز ذکری فرقے کے تین بلوچ فرزندوں پر اغواء کیا گیا اور لوکل گاڑیوں کو جلایا گیا صرف وجہ یہی کہ انکی ہمدردیاں آزادی پسندوں کے ساتھ ہیں۔بلوچ نسل کشی میں پاکستانی فورسز اپنے آپکو بے قصور ثابت کرنے کیلئے اسے مذہبی فرقہ واریت کا نام دیتے ہیں۔تاکہ اپنے گھناؤنے عمل کو دنیا کے سامنے چھپا سکیں۔اس کا واضح ثبوت آواران عبادت گاہ میں بلوچ فرزندوں کی شہادت کے دوسرے روز پاکستان آرمی کا آواران بازار میں مدرسے کی حفاظت میں سیکورٹی تعینات کرکے یہ پروپیگنڈہ کرنا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ ذکری کا فر اپنے اوپر ہونے والے حملے کے ردعمل میں مدرسوں کو نشانہ بنائیں۔کوئی بھی یہ سمجھتا ہے یہ ذکری بلوچوں پر حملہ ہے تو شاید وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے۔کیونکہ یہ حملہ بلوچ آزادی پسندوں کے خلاف بلوچ نسل کش پالیسیوں کا تسلسل ہے۔ممکن ہے کہ آگے اور بھی بڑی نوعیت کے واقعے نمودار ہوں۔آگے پھر پاکستانی فورسز اس نوعیت کے اور حملے مدرسوں میں بھی کرواسکتی ہیں تاکہ ذکر اور نماز کے نام پر ایک بڑا تضاد پیدا کرسکے۔اب بلوچ اس بات کا کس طرح جائزہ لیتے ہیں اور کس طرح اس واقعے کے خلاف اپنی حکمت عملی ترتیب دیتے ہیں۔ان کو چاہیے کہ وہ اتحاد واتفاق کا ماحول پیدا کریں کیونکہ ریاست مکمل طور پر شازش میں مصروف عمل ہے۔آواران واقعے سے چند روز قبل لشکر خراسان کی جانب سے ذکری اور ہندوؤں کے خلاف وال چاکنگ کی گئی۔لشکر خراسان اور خراسان طالبان ایک ہی دن نمودار ہوتے ہیں یہ خود ایک سوال ہے جس کے بارے میں بی بی سی نے رپورٹ کی تھی، دراصل بلوچ معاشرہ رواداری کو اب بھی برقرار رکھتے ہوئے بلوچ قومی آزادی کی خاطر جدوجہد کررہی ہے۔اب بھی باہمی احترام اور یکجہتی کے عمل کو پروان چڑھا کر قابض پاکستان کے ہر حربے کو ناکام بنانا ہوگا۔

☆☆☆

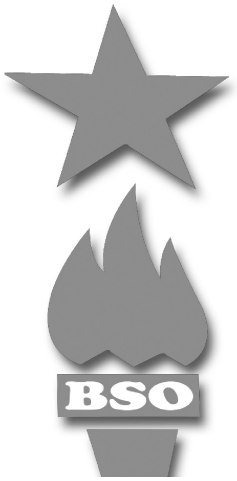

خاتمہ غلامی اور عالمی تحریکیں

نودان بلوچ

اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں یورپ کی معیشت میں ایک بڑی تبدیلی وقوع پذیر ہوئی جس نے غلامی کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ تبدیلی صنعتی انقلاب (RevolutionIndustrial) کہلاتی ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی تک کا یورپ تضادات کا مجموعہ رہا ہے۔ ایک طرف یہاں چرچ کی جانب سے انکوئزیشن کے ادارے نے لوگوں کو نفسیاتی غلامی پر مجبور کیا اور دوسری طرف اس کے ردعمل میں آزادی فکر کی ایک عظیم تحریک نے جنم لیا۔ ایک طرف یورپی اقوام ایشیا، امریکہ اور افریقہ کے عوام کو غلام بنا کر ان کے وسائل لوٹتی رہیں اور دوسری طرف خود یورپ میں غلاموں کی آزادی کی تحریک پیدا ہوئی۔ ایک طرف جنوبی یورپ کے ممالک جیسے اٹلی اور اسپین میں مذہبی انتہا پسندی کی سی کیفیت رہی اور دوسری طرف مغربی یورپ کے ممالک جیسے فرانس اور برطانیہ میں پروٹسٹنٹ ازم، انلائٹمنٹ، اور آزادی فکر کی تحریکیں پنپتی رہیں۔ اس باب میں ہم یورپ سے آغاز کرتے ہوئے دنیا بھر میں غلامی کے خاتمے کی تحریک کا جائزہ لیں گے۔

یورپ میں آزادی فکر کی تحریک

یورپ میں آزادی فکر کی تحریک کا آغاز سترہویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں ہوا۔ انکوئزیشن کی عدالت نے جب جیارڈانو برونو کو 1600ء موت کی سزا سنائی تو اس کے نتیجے میں پورے یورپ میں ایک فطری ردعمل پیدا ہوا۔ برونو کا جرم یہ تھا کہ مذہب اور کائنات سے متعلق ان کے عقائد چرچ کے عقائد سے مختلف تھے۔ الزامات ثابت ہونے کے بعد برونو سے توبہ کرنے کے لئے کہا گیا جس سے انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر انکوئزیشن کی عدالت نے برونو کو موت کی سزا دے دی۔

برونو اور دیگر فلسفیوں کو دی جانے والی سزاؤں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے یورپ میں چرچ کے خلاف ردعمل کی تحریک پیدا ہوتی چلی گئی۔ اس تحریک کی رفتار شروع میں کافی سست تھی۔ سترہویں صدی کے اختتام تک "آزاد مفکر (Thinker Free)" کی اصطلاح برطانیہ میں وجود میں آ چکی تھی۔ 1697ء میں ولیم مولینکس اور 1713ء میں انتھونی کولنس کی آزاد فکر سے متعلق تحریریں یورپ میں مقبولیت اختیار کرنے لگیں۔ فرانس میں یہ تحریک کچھ عرصہ بعد مضبوط ہوئی اور اس پر پہلی باقاعدہ تحریر 1765ء میں منظر عام پر آئی۔ اس دور کے مشہور فلسفی ایمانویل کانٹ لکھتے ہیں:

اس قسم کی روشن خیالی کے لئے سب سے زیادہ ضرورت آزادی کی ہے۔ زیر بحث آزادی، ہر قسم کی آزادیوں کی سب سے بے ضرر قسم ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر معاملے میں انسانی عقل کو کھلے عام استعمال کیا جائے۔ لیکن میں ہر طرف سے یہی پکار سنتا ہوں، "بحث نہیں کرو۔" (فوجی) آفیسر کہتا ہے، "بحث نہیں کرو، پریڈ پر چلو۔" ٹیکس وصول کرنے والا کہتا ہے، "بحث نہیں کرو، ٹیکس ادا کرو۔" مذہبی راہنما کہتا ہے، "بحث نہیں کرو، (میری بات پر) ایمان لاؤ۔" دنیا میں صرف ایک حکمران ایسا ہے جو کہتا ہے، "جتنی چاہے بحث کرو اور جس موضوع پر چاہو بحث کرو لیکن میری اطاعت بہرحال کرو۔"

انگلینڈ کی نسبت فرانس کی تحریک میں الحاد یعنی خدا کے انکار کا پہلو زیادہ نمایاں تھا۔ یہ خیالات یورپ بھر میں پھیلتے چلے گئے۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں یہ تحریک جرمنی میں کافی مضبوط ہو چکی تھی۔ 1848ء میں جرمن انقلاب کے بعد آزاد مفکرین جن میں دہریے اور ملحدین بھی شامل تھے کی بڑی تعداد جرمنی سے ہجرت کر کے امریکہ کے علاقے ٹیکساس میں آ کر آباد ہو گئی جس کے نتیجے میں اس تحریک کے اثرات امریکہ تک بھی پہنچے۔

یورپ میں آزادی فکر کی تحریک کا ایک بڑا نتیجہ انقلاب فرانس کی صورت میں نکلا جس کے نتیجے میں یہاں بادشاہت کا خاتمہ اور جمہوریت کا ارتقا ہوا۔ اس عامل نے بھی غلامی کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔

کیپیٹل ازم اور غلامی

اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں یورپ کی معیشت میں ایک بڑی تبدیلی وقوع پذیر ہوئی جس نے غلامی کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ تبدیلی صنعتی انقلاب (RevolutionIndustrial) کہلاتی ہے۔ اس سے پہلے یورپ کی معیشت بھی ایک زرعی معیشت تھی جسے چلانے کے لئے جاگیردارانہ نظام اپنے تمام تر ظلم و ستم کے ساتھ موجود تھا۔ زیادہ تر یورپی ممالک میں کھیت کسی فیوڈل لارڈ کی جاگیر ہوا کرتے تھے اور ان کھیتوں پر کام کرنے والے لوگ اس لارڈ کے غلام یا نیم غلام ہوا کرتے تھے۔

صنعتی انقلاب کے بعد یورپ اور اس کی کالونی امریکہ میں بڑے پیمانے پر صنعتیں لگانے کا عمل

شروع ہوا۔ان صنعتوں میں بڑی تعداد میں کارکنوں کی ضرورت پڑی۔ یہ کارکن زرعی فارموں میں بطور غلام موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داروں نے ان کارکنوں کے حصول کے لئے غلامی کے خاتمے کی تحریک کا بالعموم ساتھ دیا۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ سرمایہ داروں نے فرار ہونے والے غلاموں کو اپنی فیکٹریوں میں پناہ دی۔ سرمایہ دار ایسا غلاموں کی محبت میں نہیں بلکہ اپنے فائدے کے لئے کررہے تھے۔

اس دور میں زرعی سیکٹر کے لئے مشینوں کی ایجاد کے بعد غلام رکھنے کی لاگت، مشین سے زیادہ پڑنے لگی جس نے غلامی کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غلام کے مقابلے میں آزاد ورکر کی پیداواری صلاحیت زیادہ تھی کیونکہ غلام کے مقابلے میں آزاد ورکر، دولت کمانے کے لئے زیادہ متحرک (Motivated) ہوا کرتا تھا۔

ایوسے ڈومر (1970CE d.) نے اپنی تحریر The Causes of Serfdom & Slavery: A Hypothesis غلامی کے خاتمے کی یہی وجوہات بیان کی ہیں۔

سرمایہ داری کے فروغ نے ایک اور قسم کی غلامی کو جنم دیا۔ مزدور کو اگرچہ ایک جگہ کام چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کی اجازت تھی لیکن اس کیا وجود اس کی حالت زرعی غلام سے بھی بدتر ہوتی چلی گئی۔ کھلے کھیتوں میں اپنی مرضی کے اوقات میں کام کرنے کی نسبت بند فیکٹری میں غیر صحت مند ماحول میں طویل اوقات کے لئے کام کرنا نہایت تکلیف دہ عمل تھا۔ اس وقت کے صنعتی مزدوروں کی حالت زار کا اندازہ کارل مارکس کی کتاب "داس کیپیٹیل" سے لگایا جاسکتا ہے۔

ان مزدوروں کی حالت زار کو بہتر بنانے کے لئے سوشلسٹ تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک نے سرمایہ دارانہ نظام کے اندر رہتے ہوئے یقیناً یہ بڑی کامیابی حاصل کی کہ مزدوروں کو میڈیکل، چھٹی، اچھی تنخواہیں اور دیگر سہولیات فراہم کردی گئیں البتہ جہاں یہ تحریک کامیاب ہوئی وہاں اس نے ایک اور قسم کی بدترین غلامی کو جنم دیا۔

کمیونزم اور غلامی

کمیونسٹ تحریک کو جب روس اور چین میں اقتدار ملا تو انہوں نے غلامی کی ایک بدترین شکل کو جنم دیا جس میں پوری پوری اقوام کو کمیونسٹ پارٹی کا غلام بنا لیا گیا۔ اس غلامی میں انسانوں کو جن حقوق سے محروم کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے:

- انسانوں کو ذاتی جائیداد رکھنے کے حق سے محروم کردیا گیا۔ ہر شخص کی ملکیت میں جو پراپرٹی تھی، اسے حکومت کی تحویل میں دے دیا گیا۔
- صرف اور صرف ایک سیاسی جماعت، کمیونسٹ پارٹی کے قیام کی اجازت دی گئی۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ کسی دوسری سیاسی جماعت یا نظریے کی بنیاد رکھ سکے۔
- سرکاری نظریے اور اقدامات پر تنقید کرنے کا حق چھین لیا گیا اور آزادی اظہار کا خاتمہ کردیا گیا۔
- لوگوں کی جان، مال اور عزت کے خلاف کاروائی کرنے کا حق سوویت انٹیلی جنس ایجنسی (KGB) کو دے دیا گیا۔
- جوزف اسٹالن کے دور میں کثیر تعداد میں ان لوگوں کو قتل کردیا گیا جن کے بارے میں یہ شبہ موجود تھا کہ وہ کمیونزم نظام سے ذرا سا بھی اختلاف رکھتے ہیں۔ اسٹالن کے دور میں جن افراد کا موت کی سزا دی گئی، ان کا اندازہ 8,000,000 سے لے کر 50,000,000 تک لگایا گیا ہے۔ درست اندازہ لگانا اس وجہ سے ممکن نہیں ہے کہ سوویت حکومت کے ریکارڈز تک کسی کو رسائی حاصل نہ تھی۔
- بسا اوقات پوری پوری کمیونٹی کو چند افراد کے جرائم کی سزا دی گئی۔ ان میں جرمن، یونانی، تاتار اور چیچنی کمیونٹیز شامل ہیں۔
- آزادی اظہار پر ہر طرح کی پابندیاں عائد کی گئیں اور سینسر شپ کو سختی سے نافذ کیا گیا۔
- عوام الناس پر اکٹھا ہو کر اجتماع کرنے یا کوئی تنظیم بنانے پر مکمل پابندی عائد کردی گئی۔
- مذہب پر پابندی عائد کر کے ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد کو بری طرح کچل دیا گیا۔ ان میں عیسائی، مسلمان، یہودی اور دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد شامل تھے۔
- حکومت کی اجازت کے بغیر کسی شخص کو ملک سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ بعض شہروں کو "بند شہر" قرار دے کر ان میں داخلے کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔
- کمیونسٹ چین میں روس کی نسبت صورتحال کچھ بہتر تھی اور لوگوں پر روس کی نسبت کم پابندیاں عائد

> اس قسم کی روشن خیالی کے لئے سب سے زیادہ ضرورت آزادی کی ہے۔ زیر بحث آزادی، ہر قسم کی آزادیوں کی سب سے بے ضرر قسم ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر معاملے میں انسانی عقل کو کھلے عام استعمال کیا جائے۔ لیکن میں ہر طرف سے یہی پکار سنتا ہوں، "بحث نہیں کرو۔" (فوجی) آفیسر کہتا ہے، "بحث نہیں کرو، پریڈ پر چلو۔" ٹیکس وصول کرنے والا کہتا ہے، "بحث نہیں کرو، ٹیکس ادا کرو۔" مذہبی راہنما کہتا ہے، "بحث نہیں کرو، (میری بات پر) ایمان لاؤ۔" دنیا میں صرف ایک حکمران ایسا ہے جو کہتا ہے، "جتنی چاہے بحث کرو اور جس موضوع پر چاہو بحث کرو لیکن میری اطاعت بہر حال کرو۔"

کی گئیں۔ مذہب کی اجازت دے دی گئی لیکن اس پر بہت سی دیگر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ سیاسی آزادی کو تقریباً ختم کر دیا گیا۔ ہر خاندان پر پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ ایک سے زائد بچہ پیدا نہیں کر سکتے۔ آزادی اظہار کی اجازت پورے کمیونسٹ دور میں موجود نہیں رہی۔

· کمیونسٹ غلامی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نظام کی جو باقیات ابھی تک کیوبا میں موجود ہیں، ان میں انسانوں پر اس قدر جبر روا رکھا گیا ہے کہ اپریل 2008ء تک یہاں کے عوام کو کمپیوٹر رکھنے کی اجازت حاصل نہ تھی۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کمیونسٹ تحریک نے سرمایہ دارانہ ممالک میں مزدوروں کو بہت سے حقوق دلا کر انہیں غلامی سے بڑی حد تک آزاد کر دیا ہے لیکن کمیونسٹ ممالک میں اس تحریک نے تاریخ کی بدترین غلامی کو جنم دیا۔

جدید مغربی دنیا میں غلامی کے خاتمے کی تحریک

آزادی فکر کی تحریک کے نتیجے میں مختلف معاشروں میں چرچ کی گرفت ڈھیلی پڑتی چلی گئی اور "آزادی فکر" اور "آزادی اظہار رائے" بڑی اقدار کے طور پر ابھریں۔ جب "فکر کی آزادی" معاشرے کی ایک بڑی قدر بن جائے تو اس کے نتیجے میں خود بخود "جسم کی آزادی" کا بھی ایک مثبت قدر بننا بعید از قیاس نہیں ہے۔ ان عوامل کے نتیجے میں یورپ اور امریکہ میں غلاموں کی آزادی کی تحریک شروع ہوئی جس کے واقعات کو ہم برطانوی محقق، بریکن کیری کی "سلیوری ٹائم لائن" کے حوالے سے بیان کریں گے۔ اس کے علاوہ ہمارے ماخذوں میں افریقہ آن لائن اور پبلک براڈ کاسٹنگ سروس شامل ہیں۔

دنیا بھر میں غلامی کے خاتمے کی ٹائم لائن کچھ یوں ہے:

· 1335ء میں اسکنڈے نیویا کے ممالک میں غلامی کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ اس کے باوجود یہاں کئی صدیوں تک غلامی موجود رہی ہے۔

· 1400ء میں یورپ کے باقی حصوں میں میں روایتی غلامی اور نیم غلامی موجود تھی۔

· 1441ء میں افریقی غلاموں کی تجارت کا آغاز ہوا۔

· 1492ء میں سقوط غرناطہ کے بعد یہودیوں اور مسلمانوں کی کثیر تعداد کو غلام بنا لیا گیا۔

· 1492ء ہی میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔

· 1510ء میں افریقی غلاموں کو نئی دنیا یعنی شمالی و جنوبی امریکہ بھیجنے کا عمل شروع ہوا۔

· 1522ء میں غلاموں کی پہلی بغاوت وقوع پذیر ہوئی۔

· 1571ء میں فرانس کے ایک شہر بورڈیاکس میں مقامی پارلیمنٹ نے شہر میں موجود تمام سیاہ فام اور مسلمان غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم جاری کیا۔

· 1600ء میں اسپین کے بادشاہ فلپ سوئم نے ہسپانوی کالونیوں میں ریڈ انڈین غلاموں کے استعمال کو ختم کرنے کا حکم دیا۔

· 1604ء اور اس کے بعد کے سالوں میں شیکسپیئر کے غلامی سے متعلق ڈراموں نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔

· 1652ء میں "SocietyReligious Friends of" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ لوگ عرف عام میں کویکر (Quakers) کہلاتے تھے۔ اس کے بانی کا نام جارج فاکس ہے۔ یہ مذہبی عیسائیوں کا ایک گروہ تھا جو موجودہ مذہبی فرقوں سے مطمئن نہ تھے۔ اگرچہ ابتدائی ایام میں اس تحریک کو مذہبی جبر کا سامنا کرنا پڑا لیکن جلد ہی یہ تحریک پورے یورپ اور امریکہ میں پھیلتی چلی گئی۔ اس تحریک نے بعد میں غلامی کے خاتمے میں اہم ترین کردار ادا کیا۔

· 1671ء میں جارج فاکس اور ان کے ساتھی ولیم ایڈمنڈسن نے بارباڈوس کا دورہ کیا۔ یہاں انہوں نے کھیتوں میں کام کرنے والے غلاموں کے مالکان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے غلاموں سے انسانی سلوک کریں اور انہیں نرمی سے عیسائیت کی تبلیغ کریں۔ اس تنبیہ کے نتیجے میں ایک بڑا جھگڑا پیدا ہوا۔

· 1676ء میں جارج فاکس نے اپنی کتاب شائع کی جس میں انہوں نے غلاموں سے انسانی سلوک کرنے کی ترغیب دی۔ یہ کتاب یورپ اور امریکہ میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کے بعد غلامی کے خلاف بہت سے حلقوں کی جانب سے کتب تواتر سے منظر عام پر آنے لگیں۔

· 1705ء میں فرار ہو جانے والے غلاموں کو نیویارک کی ریاست نے موت کی سزا دینے کا قانون بنایا۔ اس کے بعد مختلف ریاستوں میں غلاموں سے متعلق قوانین سخت ہوتے چلے گئے اور ان سے بہت سے حقوق چھین لئے گئے۔ ان قوانین میں غلاموں کو ایک بے جان جائیداد قرار دیا گیا۔

· 1712ء میں پنسلوانیا نے غلاموں کی امپورٹ پر پابندی عائد کر دی۔ اسی سال غلاموں کی بغاوت بھی ہوئی جس میں انیس باغیوں کو موت کی سزا دے دی گئی۔

· 1723ء میں ورجینیا میں غلاموں کو آزادی دینے پر پابندی عائد کر دی گئی۔

· 1723ء ہی میں روس میں غلامی کے خاتمے کا اعلان کیا گیا۔

· 1730-1750ء کے درمیانی عرصے میں امریکہ میں غلاموں کی تعداد آزاد افراد کی نسبت زیادہ ہو گئی۔

· 1739ء میں جنوبی کیرولینا میں غلاموں کی

ایک اور بڑی بغاوت ہوئی جس میں 40 سیاہ فام اور 20 سفید فام افراد مارے گئے۔

· 1758ء میں کویکرز نے اپنے ممبرز پر یہ پابندی عائد کردی کہ وہ غلام نہیں رکھ سکیں گے۔

· 1775ء میں امریکہ میں غلامی کے خاتمے کی پہلی سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔

· 1776ء میں امریکہ، برطانوی غلامی سے آزاد ہوگیا۔

· 1783ء کے بعد برطانیہ میں غلامی کے خاتمے کی تحریک زور پکڑتی گئی۔ اگلے دو عشروں میں کویکر اور دیگر تحریکوں نے غلامی پر پابندی عائد کرنے کی زبردست مہم چلائی۔

· 1784ء میں امریکہ میں غلامی کے خاتمے کے حامیوں کی پیش کردہ تجویز کو مسترد کر دیا گیا کہ 1800ء کے بعد غلامی کو مکمل ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد کے عرصے میں مختلف ریاستوں میں کچھ قانون بنائے گئے جن میں کچھ غلاموں کے حق میں اور کچھ ان کے خلاف تھے۔

· 1791ء میں فرانس میں غلامی کے خاتمے کا قانون بنایا گیا لیکن 1802ء میں اسے منسوخ کر کے دوبارہ غلامی کی اجازت دے دی گئی۔

· 1793ء میں امریکہ میں ایک قانون منظور ہوا جس کے تحت فرار ہو جانے والے غلاموں کو پکڑنے کی کوششوں میں ڈالی جانے والی رکاوٹوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔

· 1800-1850ء کے درمیانی عرصے میں امریکہ میں غلاموں کی بہت سی بغاوتیں ہوئیں۔ غلاموں کے فرار میں اضافہ ہوا۔ ان میں سے بہت سے غلام کینیڈا میں جا کر چھپ گئے اور کینیڈا کی حکومت نے انہیں پکڑ کر واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ اس عرصے میں مختلف ریاستوں میں قانون سازی کا عمل جاری رہا جن میں کچھ قوانین غلاموں کے حق میں اور کچھ ان کے خلاف تھے۔ بعض ریاستوں میں غلاموں کو آزادی دینے کی اجازت دے دی گئی۔ اسی دوران مختلف ریاستوں میں "اینٹی غلامی" سوسائٹیوں کا قیام عمل میں لایا جاتا رہا۔ بعض ریاستوں میں غلامی پر پابندی عائد کی جانے لگی۔

· 1807ء میں برطانیہ میں غلاموں کی تجارت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کے بعد غلاموں کو لانے والے بحری جہازوں کے کپتانوں پر سو پاؤنڈ فی غلام جرمانہ عائد کیا جانے لگا۔

· 1807ء ہی میں جرمنی میں غلامی پر پابندی لگا دی گئی۔

· 1808ء میں امریکہ میں افریقہ سے غلاموں کی امپورٹ پر پابندی عائد کر دی گئی البتہ ان کی اسمگلنگ اس کے بعد بھی جاری رہی۔

· 1807-35ء کے عرصے میں برازیل کے علاقے باھیہ میں مسلمان افریقی غلاموں نے ایک بڑی بغاوت پیدا کی۔ انہوں نے اسے جہاد قرار دیا۔ اس میں غلاموں کے ساتھ ساتھ آزاد مسلمان بھی شریک ہوئے۔ یہ بغاوت کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کی تفصیلات محمد شریف بن فرید نے اپنی کتاب ''Bahia RevoltSlave'' میں بیان کی ہیں۔

· 1819ء میں ورجینیا کی ریاست نے غلام یا آزاد، سیاہ فام افراد کو تعلیم دینے پر پابندی عائد کر دی۔ اسی اثنا میں بعض دیگر ریاستوں جیسے جارجیا وغیرہ میں غلاموں کی تجارت پر پابندی عائد کر دی گئی۔

· 1833ء میں برطانیہ میں غلامی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ اس قانون کا اطلاق برطانوی کالونیوں بشمول ہندوستان، پر بھی ہوتا تھا لیکن وہاں غلامی کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔

· 1835ء میں امریکہ میں غلامی کے خاتمے سے متعلق لٹریچر شائع کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔

· 1849-50ء میں امریکہ میں غلاموں میں فرار ہو کر ان ریاستوں میں جانے کا رجحان رہا جہاں غلامی پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

· 1850ء ہی میں فرانس میں غلامی پر دوبارہ پابندی عائد کر دی گئی لیکن افریقہ میں فرانسیسی نو آبادیوں میں غلامی اس کے بعد بھی جاری رہی۔

· 1852ء میں امریکہ میں غلاموں کی حالت زار سے متعلق ایک ناول شائع ہوا جس کی تین لاکھ کاپیاں بہت کم عرصے میں فروخت ہوگئیں۔

· 1857ء میں امریکی سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ سیاہ فام امریکی شہری نہیں ہو سکتے اور کانگریس کو غلامی کے خلاف قانون سازی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

· 1860ء کے عشرے میں امریکہ کی خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ ٹیکساس نے غلاموں کو آزادی دینے کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ خانہ جنگی میں بعض افواج نے غلاموں کو بطور فوجی قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن بعض افواج نے انہیں اپنا حصہ بنا لیا۔ ابرہام لنکن امریکہ کے صدر منتخب ہوئے اور انہوں نے غلامی کے خاتمے کا منصوبہ پیش کیا۔

· 1861ء میں روس میں مزارعوں کی آزادی کی اصلاح کو نافذ کیا گیا۔

· 1865ء میں امریکی آئین میں تیرہویں ترمیم کے ذریعے غلامی کے خاتمے کا مکمل اعلان کر دیا گیا۔ اس قانون کا اثر نہ صرف امریکہ میں ہوا بلکہ اس نے آنے والے وقت میں دنیا کے بہت سے حصوں میں بھی غلامی کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔ افسوس ابرہام لنکن کے جانشین موجودہ دور میں دیگر اقوام کے وسائل پر قبضہ کرنے کے انہیں غلام بنانے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالی کے عروج و زوال کے قانون

کے تحت بعید نہیں کہ اس جرم کی پاداش میں اگلے چند عشروں میں انہیں سپر پاور کی حیثیت سے معزول کر دیا جائے۔

- 1888ء میں برازیل میں غلامی کے مکمل خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس سے پہلے 1871 میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اب سے غلاموں کے جو بچے بھی پیدا ہوں گے وہ آزاد ہوں گے۔
- 1910ء میں چین میں غلامی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا لیکن اس کے بیس سال بعد بھی غلام بچوں کی بڑی تعداد چین میں موجود تھی۔
- 1948ء میں اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت غلامی کی ہر حالت کو ممنوع قرار دیا گیا۔

ان تفصیلات کا جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کے ادارے کا خاتمہ کوئی آسان عمل نہ تھا۔ غلامی کے خاتمے کی تحریک کو یورپ اور امریکا میں بھی زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس کے بعد جا کر کہیں غلامی کا قانون کی حد تک خاتمہ ممکن ہو سکا ہے۔ جہاں تک غیر قانونی غلامی اور نیم غلامی کا تعلق ہے تو یہ دنیا میں اب بھی موجود ہے۔

موجودہ مغربی معاشروں میں غلاموں کی اب چھٹی ساتویں نسل موجود ہے لیکن آج تک وہ اپنے معاشروں میں جذب نہیں ہو سکے۔ ایک افریقی امریکی مصنفہ ڈاکٹر روزی ملیگن لکھتی ہیں:

غلامی کے بعد کے اثرات نے رنگ دار نسل کے لوگوں کے ذہنوں اور معاش کو غلامی کے بہت عرصے بعد بھی تباہ کئے رکھا ہے۔ معاشرے میں اب بھی نسل پرستی موجود ہے۔ بدقسمتی سے یہ ان نحوستوں میں سے ایک ہے جن کا سامنا ایک سیاہ فام کو اپنی معاشی جدوجہد میں کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔ چیزیں بدل چکی ہیں اور وقت مختلف ہے لیکن بہت سے سیاہ فام آج بھی انصاف کے حصول کی جدوجہد کے بعد کے نتائج کو بھگت رہے ہیں۔۔۔

نسل پرستی کی پکار نے ہمیں جذباتی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا ہے اور ہم مسلسل خود پر مسلط احساس کمتری، احساس محرومی اندرونی کمزوری کا شکار ہیں۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ہمیں تعلقات بڑھانے کے ذریعے اور کاروبار میں کامیاب حکمت عملی اختیار کرنے کے ذریعے اپنی معاشی بنیاد کو مضبوط بنانا ہے۔ ہمیں غلامانہ ذہنیت سے نجات حاصل کرنا ہو گی تا کہ ہمارے دماغ نفسیاتی اندھے پن اور ذہنی جمود سے آزاد ہو سکیں۔ یہ وہ سنگین بیماریاں ہیں جو سیاہ فام افراد کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

جدید مسلم دنیا میں غلامی کے خاتمے کی تحریک

جدید مسلم دنیا میں غلامی کے خاتمے کے لئے چند عوامل نے اہم کردار ادا کیا۔ ان عوامل میں سب سے اہم اور فیصلہ کن عامل یہ تھا کہ مغرب میں غلاموں کی آزادی کی تحریک کا اثر یورپی اقوام کی نوآبادیات پر بھی پڑا۔ 1844ء میں برطانوی حکومت نے برصغیر میں غلامی کے خاتمے کا ایکٹ نافذ کیا۔ یہی کام مصر میں انہوں نے 1896ء میں کیا۔ جن ممالک میں ان کی نوآبادیات قائم نہیں تھیں وہاں انہوں نے متعلقہ حکومتوں پر دباؤ ڈال کر انہیں اس بات کے لئے مجبور کیا کہ وہ غلامی کو غیر قانونی قرار دے دیں۔

غلامی کے خاتمے میں اگرچہ مغربی دباؤ نے اہم ترین اور فیصلہ کن کردار ادا کیا مگر یہ بات درست نہیں ہے کہ اس میں مسلم معاشروں کے اندر کوئی اندرونی دباؤ موجود نہ رہا تھا۔ انیسویں صدی کی مسلم فکر میں غلامی سے متعلق سوچ گہری تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان میں سے بعض کی طرف بی بی سی کے مقالہ نگار نے بھی اشارہ کیا ہے۔ ان تبدیلیوں کی تفصیل یہ ہے:

- غلاموں کی اٹلانٹک تجارت کے خاتمے نے بعض مسلم مفکرین میں غیرت پیدا کی کہ غیر مسلم تو اپنے غلاموں کو آزاد کر رہے ہیں جبکہ مسلمان اپنے دین کی تعلیمات کے باوجود انہیں بدستور غلامی بنائے رکھے ہوئے ہیں۔
- بعض مفکرین نے انسانی مساوات کے اسلامی تصور کو وہی اہمیت دینا شروع کر دی جسے ایک عرصے سے مسلمانوں کے ذہن لوگ بھلا چکے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں غلامی کے ایک غیر انسانی ادارہ ہونے کا تصور پیدا ہوا۔
- جب تک مسلمان دوسروں کو غلام بناتے رہے، انہیں یہ اندازہ نہ ہوا کہ غلامی کتنی بری چیز ہے لیکن جب یورپی اقوام نے آ کر انہیں غلام بنایا، تب انہیں اس کی شناعت کا اندازہ ہوا۔ مسلمانوں کے قوم پرست مفکرین نے یورپی اقوام کے کالونیل ازم کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی تحریک شروع کی۔ ان کے نزدیک مسلم ممالک میں غلامی، اینٹی کالونیل ازم کی تحریک کے خلاف تھی۔ اس تصور کی بائی پراڈکٹ کے طور پر اینٹی غلامی تحریک بھی پیدا ہوئی۔
- مسلمانوں کے جدیدیت پسند مفکرین نے محسوس کیا کہ غلامی، دور جدید سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ان میں سے جو لوگ مغربی اقوام کے مقلد بنے، انہوں نے مغربی اقوام کی تقلید میں غلامی کے خاتمے پر زور دینا شروع کیا۔
- یورپی اقوام کے صنعتی انقلاب کے اثرات مسلم دنیا تک پہنچنا شروع ہوئے جن کے نتیجے میں مسلم معاشروں میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ وہی معاشی اور معاشرتی تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہو گئیں جن کی سرمایہ دارانہ نظام کو ضرورت تھی۔ لوگ دیہات کو چھوڑ کر شہروں کا رخ کرنے لگے۔ زرعی مزدوروں کی جگہ صنعتی مزدوروں کی ضرورت پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں جاگیردارانہ نظام کا زوال شروع ہوا۔ اس عامل نے بھی غلامی کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔

مسلم دنیا میں غلامی کے خاتمے کی ٹائم لائن کی تفصیلات یہ ہیں:

· 1810ء کے عشرے میں افریقہ کے وسطی علاقوں بالخصوص نائجر اور نائجیریا میں "سکوٹو خلافت" قائم ہوئی۔ یہ خلافت غلاموں کی بغاوت کے نتیجے میں قائم ہوئی اور انہوں نے اسلامی شریعت کو اپنا منبع قرار دیا۔ اس کے لیڈر عثمان ڈان فوڈیو تھے۔ اس خلافت نے غلاموں کو امریکہ ایکسپورٹ کرنے سے روکنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ریاست میں افریقی غلاموں کی صورتحال میں کافی بہتری پیدا ہوئی مگر غلاموں کی تجارت کا مکمل خاتمہ نہ کیا جا سکا۔ بعد میں یہ خلافت برطانوی افواج کا مقابلہ نہ کر سکتے ہوئے ختم ہوگئی۔

· 1844ء میں برطانوی حکومت نے برصغیر پاک و ہند میں غلامی کے خاتمے کا قانون پاس کیا۔

· 1846ء میں تیونس پہلا مسلم ملک تھا جہاں غلامی کا خاتمہ کر کے اس پر پابندی عائد کر دی گئی۔

· 1847ء میں سلطنت عثمانیہ کے ایک حکم کے تحت خلیج فارس میں غلاموں کی تجارت کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔

· 1857ء میں افریقی غلاموں کی تجارت کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔

· 1864ء میں جارجیا اور آذربائیجان کے علاقوں سے بچوں کو غلام بنا کر لانے پر پابندی عائد کر دی گئی۔

· 1867ء میں سلطنت عثمانیہ نے روس میں موجود غلاموں کو اپنی آزادی خریدنے میں مالی امداد فراہم کرنے کا اعلان کیا۔

· 1876ء میں سلطنت عثمانیہ میں بھی غلامی کو ممنوع قرار دے دیا گیا لیکن عملی طور پر غلامی سلطنت کے مختلف علاقوں میں موجود رہی۔ 1908ء تک استنبول میں غلام بیچے جاتے رہے۔

· 1880-1887ء کے دوران سلطنت عثمانیہ نے برطانیہ سے متعدد معاہدے کئے جن کی رو سے غلاموں کی تجارت کو تدریجاً ختم کیا جانا تھا۔

· 1923-24ء میں عراق اور افغانستان میں غلامی کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد ایران میں بھی غلامی ممنوع قرار پائی۔ سوڈان میں بھی غلامی کو ختم کرنے کا قانون بنایا گیا لیکن عملی طور پر اسے ختم کرنا آج تک ممکن نہیں ہو سکا۔

· 1952-1970ء درمیانی عرصے میں خلیج کی عرب ریاستوں میں غلامی کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔

· 1990ء میں قاہرہ میں مسلم ممالک کے وزراء خارجہ کی ایک کانفرنس میں متفقہ طور پر غلامی کو غیر قانونی اور غیر اسلامی قرار دے دیا گیا۔

· 2003ء میں نائیجر میں غلام رکھنے کو جرم قرار دیا گیا۔ اس سے پہلے اگرچہ یہاں فرانسیسی قانون کے تحت سرکاری طور پر غلامی کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا تھا لیکن عملی طور پر غلامی موجود تھی۔

· 2007ء میں موریطانیہ نے بھی غلام رکھنے کو جرم قرار دیا۔ یہ غلامی کے خلاف اقدام کرنے والا آخری ملک تھا۔

یہ درست ہے کہ مسلم معاشروں میں غلامی کے حالیہ خاتمے میں فیصلہ کن کردار مغربی اثر نے ادا کیا ہے لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ مسلم معاشرے میں غلامی کے خلاف کوئی تحریک سرے سے موجود ہی نہ رہی تھی۔ کلارنس اسمتھ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(مسلم معاشروں میں) غلامی کی مخالفت، عام خیال کے برعکس، مغربی اثرات کا نتیجہ نہیں ہے۔ (شام و لبنان کے) دروز فرقے نے گیارہویں صدی میں اپنے اندر غلامی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ اگرچہ یہ لوگ، عام مسلمانوں سے ہٹا ہوا ایک اسماعلی فرقہ ہیں اس وجہ سے ان کا اثر وسیع کمیونٹی میں نہ پھیل سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اثر عظیم تر شام (یعنی موجودہ شام، اردن، فلسطین اور لبنان پر مشتمل علاقہ) کے پہاڑوں ہی میں محدود رہا ہے۔

بارود استعمال کرنے والی سلطنتوں میں سولہویں صدی میں جو اصلاحات کی گئی ہیں، وہ اگرچہ زیادہ فرق نہیں پیدا کر سکیں لیکن چونکا دینے والی ضرور ہیں۔ ان اصلاحات میں سب سے بہتر معاملہ انڈیا کے مغل شہنشاہ اکبر (1556-1605CE) کا ہے۔ یہ ممکن تھا کہ اگر اس کی اصلاحات کا تسلسل جاری رہتا تو اس کے دور میں غلامی کا خاتمہ ہو جاتا۔ ان اصلاحات کا کم سے کم پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں ٹمبکٹو (نائیجر) سے لے کر سولاوسی (انڈونیشیا) تک کے مصلحین میں یہ روایت موجود رہی ہے کہ انہوں نے غلاموں کے استعمال اور غلام بنائے جانے کی شکلوں پر اعتراض کر کے ان کی طرف توجہ دلائی ہے۔

مسلمانوں کے ہاں غلامی کے خاتمے کی جو تحریک 1870 کے عشرے سے شروع ہوئی، یہ صرف اور صرف مغربی دباؤ کا نتیجہ نہ تھی۔ مختلف قسم کے مصلحین نے تجدید و اصلاح کی تحریک کے حصے کے طور پر مذہب کے اصل ماخذ بالخصوص قرآن کی طرف رجوع کیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مقدس ماخذوں میں غلامی کی بنیادیں اگر غائب نہیں تو بہرحال بہت کمزور ہیں۔ قرآن نے کہیں یہ اجازت نہیں دی کہ پیغمبر کے سوا کوئی اور نئے غلام بنا سکتا ہے۔ اس نے بار بار پہلے سے موجود غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی ہے۔

حدیث کے لٹریچر میں غلامی کی حمایت میں بہت کم مواد ملتا ہے اور ان روایات کے مستند ہونے پر بہت سے مصلحین نے اعتراض کیا ہے۔ غلامی کی پوری عمارت جو فقہ کے تہائی حصے کے قوانین پر کھڑی ہے اور جس کا استعمال وسطی اور جنوبی ایشیا میں کیا جاتا رہا ہے، محض

اجتہاد اور قیاس کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے۔

مصلحین کو چار گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(پہلا گروہ) دیہی اور دور دراز علاقوں میں، صوفیانہ بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھنے والے کچھ علماء کا ہے جن میں غلامی کے خاتمے کا نقطۂ نظر ارتقاء پذیر ہوا۔ اس کی سب سے شدید شکل وہ ہے جو مراکش کے احمد بن خالد النصیری نے بیان کی ہے کہ چونکہ رسول اللہ کے صحابہ سے لے کر آج تک کی کسی جنگ کو مقدس جہاد کا نام نہیں دیا جاسکتا، اس وجہ سے ان جنگوں میں جن لوگوں کو غلام بنایا گیا، وہ قانونی طور پر غلام نہیں ہیں۔ چونکہ عہد رسالت سے لے کر آج تک کے غلاموں کے درمیان کوئی نسلی زنجیر موجود نہیں ہے اس وجہ سے تمام غلاموں کو آزاد کر دینا چاہیے۔ مغربی افریقہ میں بعد میں موسیٰ کمارا نے یہی نظریات پیش کئے۔

(دوسرا گروہ) ہزار سال کے بعد مہدی کی آمد پر یقین رکھنے والی تحریکوں کا ہے جن میں غیر روایتی نظریات پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک تحریک جو 1900 کے عشرے میں نائیجیریا اور نائیجر میں موجود رہی ہے، اس نے غلامی کی بنیاد اور اقسام کو ختم کر دینے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے اس مطالبے کو قیامت سے پہلے زمین کو عدل سے بھر دینے کے عمل کا حصہ قرار دیا۔ دیگر مہدوی تحریکوں میں اگرچہ یہ بات واضح طور پر نہیں کہی گئی لیکن ان میں بھی غلاموں کو آزادی دینے کا پوٹینشل موجود تھا۔

(تیسرا گروہ) تدریجی اصلاح کے حامی متجددین کا ہے۔ یہ اکثر اوقات شہری اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے اور (روایتی) علماء کے طبقے سے کم ہی تعلق رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ان کا اثر بڑھتا گیا۔ یہ لوگ خاص طور پر بنگال سے تعلق رکھنے والے شیعہ مصلح سید امیر علی اور مصر کے مفتی اعظم محمد عبدہ کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے دلائل پیش کئے کہ رسول اللہ نے ذاتی طور پر غلامی کی مخالفت کی ہے۔ اگر آپ کو لوگوں کے اسلام چھوڑ جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو آپ اس پر واضح الفاظ میں پابندی عائد فرما دیتے۔ اب چونکہ غیر مسلموں نے غلاموں کو آزادی دینے کا راستہ اختیار کر لیا ہے، اس وجہ سے اب وہ وقت ہے کہ خدا کے حکم کو زندہ کیا جائے اور اس کے پیغمبر کی منشاء کو پورا کیا جائے۔

(چوتھا گروہ) شدت پسند متجددین کا ہے۔ انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ رسول اللہ نے واضح طور پر نئے غلام بنانے کو حرام قرار دیا ہے اور پہلے سے موجود غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ مسلمانوں کی بعد کی نسلوں نے آپ کے احکام کی خلاف ورزی کر کے ایک عظیم گناہ کیا ہے۔ درحقیقت یہی وہ وجہ ہے کہ غیر مسلم، اہل ایمان کی نسبت زیادہ طاقتور ہو گئے ہیں۔ اس نقطہ نظر کے ذریعے غلامی کے خاتمے کے علمبردار روسی تاتارستان میں یہ نقطہ نظر موسیٰ جار اللہ بیگ نے پیش کیا۔

(مسلم ممالک میں غلاموں کی) آزادی سے متعلق قانون سازی کے پیچھے مغرب کی کالونیل حکومتوں، کٹھ پتلی مسلم حکمرانوں اور سیکولر مسلم سیاستدانوں کا ہاتھ تھا لیکن قانون اور سماجی حقیقت کے درمیان ایک وسیع خلیج برقرار رہی۔ یہ بالکل منشیات ہی کی طرز کا معاملہ ہے کہ ایک چیز اس کے خلاف بین الاقوامی مہم ہے اور دوسری چیز اس پر حقیقی عمل درآمد کروانا ہے۔ مسلمانوں کی تجدید و احیائے دین کی کوششوں کے نتیجے میں غلاموں کی آزادی کی مختلف شکلیں وجود میں آئیں جس کے نتیجے میں قانون سازی کے اثرات زندہ معاشرے میں رونما ہوئے۔ جہاں ایسا نہ ہو سکا، وہاں (باوجود قانون سازی کے) غلامی موجود رہی (اور کافی عرصے میں جا کر ختم ہوئی۔) مثال کے طور پر افریقہ کی ساحلی پٹی جس میں موریطانیہ، سوڈان، جزیرہ نما عرب، ایران، پاکستان اور افغانستان شامل ہیں۔

سرمایہ داری کے فروغ نے ایک اور قسم کی غلامی کو جنم دیا۔ مزدور کو اگرچہ ایک جگہ کام چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کی اجازت تھی لیکن اس کے باوجود اس کی حالت زرعی غلام سے بھی بدتر ہوتی چلی گئی۔ کھلے کھیتوں میں اپنی مرضی کے اوقات میں کام کرنے کی نسبت بند فیکٹری میں غیر صحت مند ماحول میں طویل اوقات کے لئے کام کرنا نہایت تکلیف دہ عمل تھا۔ اس وقت کے صنعتی مزدوروں کی حالت زار کا اندازہ کارل مارکس کی کتاب "داس کیپٹل" سے لگایا جا سکتا ہے۔

دور جدید کے مسلم معاشروں کو ہم بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک تو قدیم عربی مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات اور دوسرے دنیاوی تعلیم پانے والے جدید تعلیم یافتہ حضرات۔ کلارنس اسمتھ نے مسلم معاشروں میں غلامی کے خلاف تحریک چلانے والے جن چار گروہوں کا ذکر کیا ہے، ان کے نقطہ ہائے نظر میں استدلال کی کچھ کمزوریاں موجود تھیں۔ اس وجہ سے ان کا اثر صرف دوسرے طبقے پر رونما ہوا۔ پہلے طبقے پر ان تحریکوں کا شروع میں تو کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ ان متجددین کو بالعموم کافر، ملحد، مرتد اور گمراہ ہی قرار دیا گیا۔

اب سے سو برس پہلے کے روایتی علماء کے لئے غلاموں کی موجودگی کوئی مسئلہ ہی نہ تھی۔ جب ان تحریکوں کے ذریعے انہیں اس طرف توجہ دلائی گئی تب انہیں علم ہوا کہ "ارے!!! انسانوں کو حقوق دلوانا اور غلاموں کی آزادی کی جدوجہد بھی کرنے کا کوئی کام ہے۔" اس کے بعد روایتی علماء کے طبقے میں سے بھی ایسے اہل علم پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے غلامی کے ادارے کو ختم کرنے کی حمایت کی اور اس ضمن میں اسلام کا نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کی۔ ایسے اہل علم کی تعداد بہرحال بہت کم ہے۔

☆☆☆

رحیم زردکوہی

☆ واجہ محمد حسین بلوچ ☆

رحیم زردکوہی قبائلی لحاظ سے مبارکی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ایران شہر کے مضافات میں ایک گاؤں بگدرکار کا رہائشی تھا۔ وہ اپنے قبائلی سردار دادشاہ مبارک سے بہت متاثر تھا دادشاہ مبارک وہ بلوچ جنگجو سردار تھا جس نے شاہ ایران کے خلاف 1957ء میں مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ دادشاہ کے بھائی احمد شاہ مبارکی کو 1957ء کے اواخر میں حکومت پاکستان نے گرفتار کر کے شاہ ایران کے حوالہ کیا تو جمعہ خان جو کہ ''ایک حساس قوم پرست نوجوان تھا'' نے اس مسئلہ کو بین الاقوامی اصول وضوابط کی خلاف ورزی سمجھ کر احتجاج کیا۔ اس طرح یہ مسئلہ ایران اور پاکستانی بلوچستان میں آگ کی طرح پھیل گیا۔ جمعہ خان جو کہ اس وقت کراچی میں ریڈیو پاکستان میں ملازم تھے، بغاوت کا الزام لگا کر جمعہ خان کے وارنٹ گرفتاری جاری کئے۔ اس نے چور چھپے بھاگ کر عرب امارات میں سیاسی پناہ حاصل کی۔ مگر جمعہ خان نے اپنے جلاوطنی کے دوران خفیہ طور پر ایران اور پاکستان کے بلوچ قوم پرستوں سے اپنا رابطہ جاری رکھا۔ ایرانی بلوچستان کے ایک قبائلی سردار شاہ بخش نے بتایا کہ اس دوراں کم ازکم 70 یا 80 بے روزگار تعلیم یافتہ بلوچ 1960ء کے آواخر میں زیرزمین چلے گئے اور انہوں نے جمعہ خان سے ملکر کام شروع کیا۔ جمعہ خان نے 1964ء میں دوسرے بلوچ رہنماوں کے ساتھ ملکر ایک تنظیم تشکیل دی جو ''بلوچستان محاز آزادی'' کہلائی۔

اشرف سربازی نے بتایا کہ سب سے بڑا اور واحد چھاپہ مار گروہ جو ایران منتقل کیا گیا وہ سو افراد پر مشتمل تھا۔ ایران میں ''بلوچستان محاز آزادی'' کا کرتا دھرتا مبارکی قبیلہ کا آتش مزاج نوجوان رحیم زردکوہی تھا جس نے عراقی امداد کے خاتمہ کے بعد بھی سیاسی طور پر باشعور 75 افراد پر مشتمل گروہ کو برقرار رکھا۔ یہ گروہ جنوبی بلوچستان میں ''آہوران'' کی پہاڑی سلسلے کی کمین گاہوں میں پناہ گزین ہوا اور یہاں سے انہوں نے اپنی کاروائیاں جاری رکھیں۔ شاہ ایران کے افواج کو ان کاروائیوں پر بہت خزیمت اٹھانا پڑا وہ اس گروہ سے بہت تنگ آچکے تھے۔ آخر کار شاہ نے دھوکے اور لالچ کا سہارا لیا اور اس طرح رحیم زردکوہی کو شہید کر دیا گیا۔

''تنقید اور جمہوری شدت پسندی''

عزت بلوچ

تنقید مثبت بھی ہوتا ہے اور منفی بھی۔ مثبت تنقید وہ ہوتی ہے جس میں پارٹی ارکان پارٹی کے اندر رہ کر پارٹی لیڈران، پالیسیوں میں خامیوں اور کمزوریوں پر سوال اُٹھاتے ہیں، اُن معاملات پر سوال کرنے کو مثبت تنقید کہا جاتا ہے جہاں پارٹی میں واقعتاً کمزوری پائی جاتی ہو۔ نقاد جب تنقید کرتے ہیں تو اُن پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی متبادل رائے سے بھی پارٹی کو آگاہ کریں۔ کیونکہ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کارکن تنقید تو کرتے ہیں لیکن جن معاملوں پر تنقید کرتے ہیں ان کا کوئی حل نہیں بتاتے۔ یہ مطالعے میں کمی کی وجہ سے ہوتی ہے یا پھر کامریڈ اتنے Commner ہوتے ہیں کہ ہر کسی کی بات سے متاثر ہو کر کنفیوز ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص پارٹی کے خلاف سنی سنائی باتوں کو پھیلا دیتی ہے، یا اُن ارکان کے سامنے ان باتوں کا اظہار کرتا ہے جن میں سوچنے اور فرق کرنے کی صلاحیت نسبتاً دوسرے کے کم ہوتی ہے تو وہ ورکر انہی سنی سنائی باتوں سے متاثر ہو کر پارٹی سے غلط فہمی کی بنیاد پر بدظن ہونے لگتے ہیں۔ اور نقطے نکالنے کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ورکر پارٹی چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں یا پھر پارٹی لیڈران پر عام محفلوں میں بظاہر تنقید کر رہے ہوتے ہیں لیکن یہ عمل اصل میں پارٹی کے خلاف جاتی ہے اور پارٹی ساکھ کو متاثر کرتی ہے۔ ایک انقلابی کارکن کا شیوہ رہا ہے کہ وہ پارٹی اداروں کے اندر رہ کر پارٹی معاملوں پر تنقید کرتے ہوئے اپنی آراء سے ادارے کو آگاہ کرتا ہے۔ جب اکثریت نے انہی آراء کو قبول کیا تو فیصلے تبدیل ہوتے ہیں اور جب اکثریت نے اتفاق رائے کا اظہار نہ کیا تو اگلی مجلس تک وہ ادارے کے فیصلوں کا پابند ہوگا اور آئندہ مجلس میں پارٹی کو پھر قائل کرنے کی کوشش کرے گا۔

ایک منجمد سماج جہاں سوچنے اور فرق کرنے کا عنصر انتہا درجے تک کم ہو، جہان پارٹی اغراض و مقاصد جانے بغیر ورکر بھرتی ہوں، جہاں پارٹیوں کو ریل گاڑی سمجھ کر اس اسٹیشن پر سوار ہو کر آنیوالے اسٹیشن پر اُترنے والے بھگوڑوں کی بھرمار ہو، وہاں جب تک سیاسی و تنقیدی شعور سے لیس کارکنان عوام یا کمزور ذہنیت کے کارکناں کی تربیت نہ کریں تو وہاں تنقید پارٹی پالیسیوں یا تحریکوں کی بہتری کے برعکس، افراد یا پارٹیوں کی کردار کشی اور انہیں نیچا دکھانے کے لئے ہوتی ہے۔ وہاں تنقید ''جو کہ انقلابی پارٹیوں کے کامیابی و ترقی کی ضامن ہوتی ہے'' کی اصل شکل مجروح ہو جاتی ہے۔ وہاں ان کمزوریوں اور ذاتی اعمال کو لیکر اُچھالا جاتا ہے جن کا پارٹی پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا۔ مثلاً ایک نقاد پارٹی لیڈر کو یہ کہہ کر نا اہل ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ اس نے دوسری شادی کیوں کی، یا تصاویر کیوں کھنچواتا ہے، یقیناً تنقید کے نام پر ایسی بے مطلب باتیں ایک سیاسی طالب علم کے لئے مضحکہ خیز ہی ہیں۔ بقول کامریڈ ماؤزے تنگ ہمیں کارکنوں کی ذاتی اعمال جو پارٹی مقاصد کو نقصان نہیں پہنچا رہے، اُن پر حد سے زیادہ تنقید کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ جب کارکنوں کو تنقیدی شعور دیئے بغیر تنقید کی اجازت دی جائے تو وہاں جمہوری شدت پسندی پروان چھڑتی ہے۔ جمہوری شدت پسندی بھی منفی تنقید کی ایک قسم ہے، جس میں کارکن تنقیدی شعور کے بغیر تنقید کر کے اپنی من مانی کرتے ہیں۔ مطلب ایک شخص جسے گاڑی چلانا نہیں آتا، اسے گاڑی چلانے کو کہتے ہیں تو وہ ٹریک سے اُتر کر ایکسیڈنٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے کارکنوں کا موقف ہوتا ہے کہ ایک جمہوری ادارے میں یہ ان کا حق بنتا ہے کہ وہ پارٹی معاملات پر تنقید کریں۔ لیکن وہ اپنے اس فرض کو بھول جاتے ہیں کہ اداروں کی معتبر ساکھ کو مد نظر رکھ کر تنقید کی جائے۔ پارٹی ورکروں میں ان کمزوریوں کی ایک بڑی وجہ خود پارٹی ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر پارٹی لیڈران تعداد بڑھانے کی تگ و دو میں ہوتے ہیں، انقلابی تعلیمات اور شعوری پختگی کے برعکس وہ ذاتی جنگجو یا مخلص اراکین پارٹی عہدوں پر تعیناتی کرتے ہوں۔ تو وہ پارٹی کے لئے دور رس نتائج نہیں دے سکتے۔ بلکہ جلد ہی پارٹی کو انتشار کی

ایک منجمد سماج جہاں سوچنے اور فرق کرنے کا عنصر انتہا درجے تک کم ہو، جہان پارٹی اغراض و مقاصد جانے بغیر ورکر بھرتی ہوں، جہاں پارٹیوں کو ریل گاڑی سمجھ کر اس اسٹیشن پر سوار ہو کر آنیوالے اسٹیشن پر اُترنے والے بھگوڑوں کی بھرمار ہو، وہاں جب تک سیاسی و تنقیدی شعور سے لیس کارکنان عوام یا کمزور ذہنیت کے کارکناں کی تربیت نہ کریں تو وہاں تنقید پارٹی پالیسیوں یا تحریکوں کی بہتری کے برعکس، افراد یا پارٹیوں کی کردار کشی اور انہیں نیچا دکھانے کے لئے ہوتی ہے۔ وہاں تنقید ''جو کہ انقلابی پارٹیوں کے کامیابی و ترقی کی ضامن ہوتی ہے'' کی اصل شکل مجروح ہو جاتی ہے۔ وہاں ان کمزوریوں اور ذاتی اعمال کو لیکر اُچھالا جاتا ہے جن کا پارٹی پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا۔

طرف لیجاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مخلص اراکین قابل احترام ہوتے ہیں۔لیکن پارٹی رہنمائی کے لئے صرف مخلصی کافی نہیں ہوتی بلکہ سیاسی شعور، ذہنی پختگی، اور فیصلہ لینے والے ارکان ہی پارٹی کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ ہزار ہا مشکلات آنے کے باوجود وہ پارٹی مقاصد سے منہ نہیں موڑتے بلکہ پارٹی بندھن میں ایسے بندھے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی جان دے کر بھی پارٹی کی ساکھ کو زک نہیں پہنچانا چاہتے۔ یہ بات یاد رہے کہ انقلابی ورکر بغیر تربیت کے پیدا نہیں ہوتے بلکہ انہیں تربیت دے کر ہی تمام مشکلات و مصائب سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی انقلابی تحریک چلی ہیں وہاں کامیابی انہی انقلابی لیڈران، وذہنی پختگی سے لیس مخلص ممبران کی وجہ سے ہی آئی ہے۔ جنہوں نے جدوجہد کی راہ میں حائل تمام مشکلات کو خندہ پیشانی سے قبول کی ہے۔ اور کسی بھی مشکل صورتحال کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کے بجائے اپنی موقف پر ڈٹے رہے۔ عام باتوں میں صرف جان کی قربانی کو جبر کی انتہا یا قربانی کی انتہا سمجھا جاتا ہے۔ جوشخص قومی مقاصد کے لئے اپنی جان سے گزرتے ہیں۔ وہ ناقابل فراموش اور ہمہ وقت محترم ہوتے ہیں۔لیکن انقلابی اور long term جنگوں مین مشکلات صرف دشمن فوجوں کی طرف سے ہونیوالی تشدد سے پیدا نہیں ہوتے، بلکہ ذہنی تھکاوٹ، دشمن کی طرف سے پھیلائے گئے پروپیگنڈے اور دیگر کئی حربے ہیں جو کارکنوں میں تربیت کی کمی کی وجہ سے جنگوں کی طوالت کے سبب کارکنوں کی مایوسی وقنوطیت کا سبب بنتے ہیں۔ ان تمام مسائل و مشکلات کو ایک انقلابی پارٹی جو انقلابی معیار پر پورا اترسکتی ہو، حل کرسکتی ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی انقلابی تحریک چلی ہیں وہاں کامیابی انہی انقلابی لیڈران، وذہنی پختگی سے لیس مخلص ممبران کی وجہ سے ہی آئی ہے۔ جنہوں نے جدوجہد کی راہ میں حائل تمام مشکلات کو خندہ پیشانی سے قبول کی ہے۔ اور کسی بھی مشکل صورتحال کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کے بجائے اپنی موقف پر ڈٹے رہے۔ عام باتوں میں صرف جان کی قربانی کو جبر کی انتہا یا قربانی کی انتہا سمجھا جاتا ہے۔ جوشخص قومی مقاصد کے لئے اپنی جان سے گزرتے ہیں۔ وہ ناقابل فراموش اور ہمہ وقت محترم ہوتے ہیں۔لیکن انقلابی اور long term جنگوں مین مشکلات صرف دشمن فوجوں کی طرف سے ہونیوالی تشدد سے پیدا نہیں ہوتے، بلکہ ذہنی تھکاوٹ، دشمن کی طرف سے پھیلائے گئے پروپیگنڈے اور دیگر کئی حربے ہیں جو کارکنوں میں تربیت کی کمی کی وجہ سے جنگوں کی طوالت کے سبب کارکنوں کی مایوسی وقنوطیت کا سبب بنتے ہیں۔ ان تمام مسائل و مشکلات کو ایک انقلابی پارٹی جو انقلابی معیار پر پورا اترسکتی ہو، حل کرسکتی ہے۔

بلوچ تحریک جو ابھی بنیادی مرحلوں میں ہے، اپنی ہیئت اور مقاصد کے حوالے مجموعی طور پر دنیا کے دوسرے انقلابی و آزادی کی تحاریک سے مختلف نہیں۔ کیونکہ قابض امریکہ ہو، چین ہو یا پاکستان، تمام ایک جیسے مقاصد کے حصول کے لئے ہی دوسروں پر قابض ہو جاتے ہیں۔ مقبوضہ عوام کو غلام بنا کر انہیں اس احساس میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں، یا ان کے سوچنے و سمجھنے کی صلاحیت کو آہستہ آہستہ اس طرح اپنے کنٹرول میں لاتے ہیں کہ وہ محدود ہو کر صرف خاندانی بہتری کے لئے ہی سوچتے ہیں۔ بلوچ معاشرہ بھی غلامی اور نوآبادیاتی تعلیم کی وجہ سے انہی مشکلات کا شکار ہے۔ جو کہ ایک انقلابی تحریک ولیڈرشپ کے لئے کسی بڑے چیلنج سے کم نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ بلوچ لیڈران کس حد تک ممکنہ مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائینگے، کیونکہ جب تک انقلابی پارٹیوں وتنظیموں میں بےخبر اور غیر تربیت یافتہ ممبران کا رش لگا رہے گا، لیڈران کی خوشنودی حاصل کرنے والے چاپلوسوں کا بول بالا ہو گا، مشکلات بڑھتے بڑھتے ایسے بڑھ جائینگے کہ ایک کمزور قوم ''جو کہ حربی، سیاسی، غرض کہ ہر حوالے سے اپنے دشمن سے کمزور ہو'' کے لئے ناقابل حل ہو جائینگے۔

ایک خامی جو بلوچ آزادی پسند پارٹیوں میں اب تک سر اٹھائے کھڑی ہے وہ یہ ہے کہ کارکنان کی تربیت کا رجحان انتہا درجے تک کم ہے جو کہ انقلاب یا انقلابی تنظیم و پارٹیوں سے ایک سنگین مزاق ہے تربیت نہ ہونے کی وجہ سے ہی کارکنان مسلح جدوجہد اور سیاست کو الگ الگ سمجھتے ہیں اور بندوق جو کہ سیاسی مقاصد کے حصول کا صرف ایک جزو ہے اسے سیاست پر فوقیت دیتے ہیں بلوچ پارٹیوں کے پالیسی ساز اداروں کو چاہیئے کہ وہ کارکنان کی تربیت کیلئے بہتر حکمت عملی تشکیل دیں تا کہ ہر علاقے وشہر میں انہیں بہترین سیاسی وانقلابی کارکن میسر ہوں جو بیک وقت بہترین بھی ہوں اور محنتی وجفاکش ورکر بھی، کیونکہ ایسے ارکان جو نیکی وبدی میں تمیز نہ کرسکتے ہوں، سست و کاہل اور جان دز ہوں وہ کسی بھی طور پارٹیوں میں نقصان وانتشار کے علاوہ کچھ نہیں لاسکتے۔

غلبہ

☆☆پاؤلوفریرے☆☆

غیر مکالماتی عمل کی پہلی خصوصیت دوسروں کو مغلوب کرنے کی ضرورت ہے۔غیر مکالماتی شخص دوسرے انسانوں کے ساتھ اپنے تعلقات میں ہمیشہ انہیں زیر کرنے کی ٹوہ (کوشش) میں رہتا ہے۔اس سلسلے میں ہر قسم کے ذرائع استعمال کرتا ہے،سخت سے سخت ترین ذرائع سے لیکر شائستہ ترین اور انتہائی ظالمانہ سے لیکر درخواست گزارانہ (پدرانہ) ذرائع تک۔زیر کرنے کا ہر عمل یہ معنی رکھتا ہے کہ کوئی زیر کرنے والا ہے اور کوئی شخص یا شے جسے زیر کیا جاتا ہے۔غالب (ظالم) مغلوب (مظلوم) پر اپنے مقاصد ٹھونستا ہے اور اسے اپنی ملکیت بناتا ہے۔وہ مغلوب کو اپنے مقاصد کے تحت ڈھالتا ہے اور اس طرح مغلوب اس صورتحال کو اپنے اندر سمو کر غالب کو اپنے دل میں جگہ دے کر ایک مبہم وجود اختیار کر جاتا ہے۔دوسروں کو زیر کرنے کا عمل جو انسانوں کو اشیاء کے درجہ پر گھٹاتا ہے،اپنے آغاز سے ہی موت سے محبت Necrophilic کرنے کا عمل ہے۔جس طرح غیر مکالماتی عمل حقیقی اور ٹھوس استبدادی صورتحال کا لازم جزو ہے اسی طرح مکالماتی عمل انقلاب کا جزو لاینفک (لازمی جزو) ہے۔کوئی بھی شخص کائنات سے مجرد طور پر نہیں بلکہ کائنات کے اندر ہی مکالماتی اور غیر مکالماتی ہوتا ہے۔وہ پہلے غیر مکالماتی اور ظالم نہیں بلکہ بیک وقت غیر مکالماتی اور ظالم ہے۔جبر کی ایک معروضی صورتحال میں ، ظالم کے لئے مکالمہ دشمنی اختیار کرنا ایک لازمی امر بنتی ہے تاکہ وہ ظلم کر سکے۔نہ صرف معاشی بلکہ ثقافتی ظلم بھی۔۔۔ثقافتی ظلم کا نتیجہ یہ نکلتا ہیکہ مغلوب اپنے لفظ ، اپنی قوت اظہار اور اپنے کلچر سے محروم ہو جاتے ہیں۔مزید یہ کہ جب ایک دفعہ جبر کی صورتحال پیدا ہو جائے تو پھر مکالمہ دشمنی اس کے تحفظ کے لئے لازمی بن جاتی ہے۔زیر کرنے کی خواہش میں غیر مکالماتی عمل ایک جزو کی کے طور پر ہمہ وقت شامل رہتا ہے،اس مقصد کے حصول کے لئے ظالم عوام کی ایک خوبی کو کچلنے کوشش کرتے ہیں اور وہ خوبی ہے عوام کی ''غور وفکر'' کرنے کی خاصیت۔چونکہ ظالم ہر حوالے سے اس خوبی کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے،اس لئے ان کے لئے کائنات کو باطل عقیدوں اور دیومالائی جھوٹ کا شکار بنانا لازمی بن جاتا ہے۔مظلوموں کو سچے غور وفکر سے الگ رکھنے کے لئے وہ کائنات کو ایک پرفریب جھوٹ کے طور پر پیش کرتے ہیں تاکہ مظلوموں کی بیگانگیت اور مفعولیت میں اضافہ ہو سکے اس طرح وہ جھوٹے اور پرفریب مسائل اور طریقوں کا ایک کینوس تیار کرتے ہیں،جس میں وہ کائنات کو ایک مسئلے کے طور پر نہیں بلکہ ایک جامد حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں،جسے اوپر ٹھونسا گیا ہے۔۔۔اور یوں جس کے مطابق انسانوں کو محض تماشائیوں کے طور پر اپنے آپ کو ڈھالنا ہے۔ظالموں پر لازم ہو جاتی ہیکہ وہ عوام کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھیں کہ انہیں زیر کرنے کے مختلف ذرائع کے ذریعے بے عمل رکھیں۔عوام کے بارے میں یہ نکتہ نظر اپنے اندر نہ تو ''عوام کے ساتھ'' ہونے اور نہ ہی عوام سے سچے تبادلہ خیال کرنے کی ضرورت رکھتا ہے،اس کا حصول وہ جھوٹے اور باطل افکار ونظریات کے پھیلاؤ سے ممکن بناتے ہیں اور در حقیقت ایسے افکار ونظریات کا پھیلاؤ جبر و استحصال کی موجودہ صورتحال کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری بھی ہے۔مثلاً یہ جھوٹ کہ جبر کا نظام ایک ''آزاد معاشرہ'' ہے۔یہ دیومالائی جھوٹ کہ تمام انسان آزاد ہیں،اور وہ جہاں اور جس جگہ چاہیں سکونت ومحنت اختیار کر سکتے ہیں۔اگر انہیں ان کا بد دماغ صاحب پسند نہیں تو اسے چھوڑ کر کسی بھی دوسری کام تلاش کر سکتے ہیں،یہ جھوٹ کہ یہ نظام انسانی حقوق کی عزت کرتا ہے۔اس لئے عزت کے قابل ہے۔یہ جھوٹ کہ ہر محنتی شخص کارخانہ دار بن سکتا ہے،اور سب پر مستزاد یہ کہ گلی میں خوانچہ اور چھابڑی لگانے والا بھی اتنا بڑا کارخانہ دار ہے جتنا کہ ایک فیکٹری مالک۔مثلاً عام تعلیم کے حق کے جھوٹ کا شکار برازیل کے وہ تمام بچے ہیں جو اسکول میں تو داخل ہوتے ہیں لیکن ان میں سے ایک قلیل تعداد ہی یونیورسٹی تک پہنچ پاتی ہے،انسانوں کی برابری کا جھوٹ جبکہ یہ سوال اب بھی ہم میں پایا جاتا ہے'' تم جانتے ہو کہ تم کس سے بات کر رہے ہو؟'' ظالم ثبات کے ہیرو ازم کا یہ جھوٹ کہ انہوں نے مادیت پسندانہ بربریت کے مقابلہ میں مغربی عیسائی تہذیب کا دفاع کیا ہے۔زعماء کی فراخدلی اور سخاوت کا جھوٹ جبکہ درحقیقت وہ جو کچھ ایک طبقہ کی حیثیت سے کرتے ہیں وہ یہ کہ بعض گنے چنے مخصوص ''اچھے افعال'' کی حوصلہ افزائی، یہ جھوٹ کہ غالب زعما ''اپنی ذمہ داری کو تسلیم کرتے ہوئے'' عوام کی ترقی میں کوشاں ہیں،چنانچہ عوام کو اظہار تشکر کے طور پر زعما کے الفاظ کو تسلیم کرنا چاہئیے،اور ان کی توثیق کرنی چاہئے،یہ جھوٹ کہ بغاوت خدا کے خلاف ایک جرم ہے،یہ جھوٹ کہ ذاتی ملکیت انسانی ترقی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے،(اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف ظالم ہی سچے انسان ہیں) ظالموں کے محنتی اور مظلوموں کے سست اور غیر ایماندار ہونے کا جھوٹ اور سب سے بڑھ کر مظلوموں کا قدرتی طور پر کمتر ہونے اور ظالموں کا قدرتی طور پر برتر ہونے کا دیومالائی جھوٹ۔

یہ تمام جھوٹا اور گمراہ کن پروپیگنڈہ (اور تمام جھوٹ جو قاری جانتے ہیں) جسے مظلوموں کو مغلوب کرنے کے لئے ان کے اندر سمونا ضروری ہے،ایک منظّم نعرہ بازی اور ''عوامی ذرائع ابلاغ'' کی مدد سے بہت عمدہ طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔جیسے کہ یہ بیگانگیت انگیز جھوٹ سچے باہمی مکالمہ پر مشتمل ہوں،مختصراً یہ کہ کوئی بھی جبری حقیقت ایسی نہیں کہ جو بیک وقت لازمی طور پر غیر مکالماتی بھی نہ ہو، قدیم روم میں حکمران زعماء نے عوام کو ''روٹی اور سرکس'' مہیا کرنے کی ضرورت پر بہت زیادہ زور دیا۔تاکہ انہیں (عوام کو) پرامن اور پرسکون بنا کر اپنے سکون اور امن کا تحفظ کیا جائے۔آج کے حکمران زعماء بھی کسی بھی دور کے حکمرانوں کی طرح دوسروں کو زیر کرنے کی ضرورت کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔روٹی اور سرکس کے ساتھ یا اس کے بغیر۔گو کہ ان کے زیر کرنے کی طریقے اور شکلیں تاریخی طور پر مختلف ہوتے ہیں مگر جو چیز مختلف نہیں وہ ظلم وستم کرنے اور موت سے محبت کرنے کا جزبہ ہے

☆☆☆

آئینہ حقائق

چیدہ چیدہ حالات، واقعات اور خبروں پر آزاد کا ماہانہ تجزیہ

ادارہ

رحانہ عمل میں مزید شدت پیدا کرنے کے لئے ایک خاص منصوبے کے تحت ریگولر آرمی کو کئی اہم علاقوں اور مقامات پر تیزی سے تعینات کیا جارہا ہے۔

اگست کا مہینہ کئی طرح سے بلوچ وبلوچستان کے لئے اہمیت کا حامل ہے۔ 11 اگست یومِ آزادی بلوچستان اور 14 اگست جیسے یوم سیاہ اسی مہینے میں آتے ہیں۔یعنی جہاں اس مہینے میں بلوچ وطن کو آزادی ملی تھی ، وہیں اس کی آزادی کو سلب کرنے کا بندوبست بھی انگریز سامراج نے پاکستان کی تشکیل کی صورت میں اسی مہینے میں کیا تھا۔لیکن اطمینان بخش امر یہ ہے کہ گذشتہ 67 سالوں سے پاکستان کے زیرِ قبضہ اپنی دبی ہوئی آزادی اور نوآبادیاتی نظام کے پارلیمانی، مذہبی اور پُرتشدد حربوں کے باوجود بلوچ قوم اپنی شناخت اور تاریخ سے دستبردار نہیں ہوا ہے، اور اپنی دبی ہوئی آزادی اور کھوئی ہوئی سیاسی اقتدار کی بحالی کے لئے تاریخ کی روشنی میں میدانِ کارزار میں مسلسل جدوجہد کرتا چلا آرہا ہے۔اس ضمن میں اب تک ہزاروں بلوچ شہید اور اغواء ہو چکے ہیں۔ جبکہ ان شہداء کی کثیر تعداد اِسی اگست کے مہینے سے جڑے ہوئے ہیں۔جن میں ڈاکٹر خالد و دلوش ، شہید رضا جہانگیرو اِمداد بُجیر،شہید الطاف بلوچ اور ڈاڈائے بلوچ اکبرخان بگٹی شامل ہیں،جنہیں محض اپنی تاریخ سے دستبردار نہ ہونے کی پاداش میں شہید کیا گیا۔اس اگست میں بھی ''مارو اور پھینک دو'' کی پالیسی جاری رہی،اور سندھ کے علاقہ سکرند میں آئی ایس آئی نے تین مغوی بلوچ فرزندان شیر دل بگٹی ولد دُرمحمد بگٹی ،سبزل بگٹی ول نواز بگٹی اور صاحب مری ولد تہ ال مری کی لاشیں مسخ کرکے پھینک دیں۔مشکے میں حسیب حسن کو فوجی کارروائی کے دوران شہید کیا گیا۔مگر دشمن کی سوچ اور خواہشات کے برعکس ان شہادتوں نے نہ صرف قومی تحریکِ آزادی کو جلا بخشا ، بلکہ انہیں جبری قبضہ گیریت کا مزید احساس دلا کر پاکستان کے خلاف ان کی خون میں موجود نفرتوں کو گہرا کرکے ان میں جدوجہد کا نیا حوصلہ پیدا کیا۔جو پاکستان کی نوآبادیاتی نظام کے خلاف وقوع پزیر ہونے والے حالیہ سیاسی اقدامات اور شدید ہوتی عسکری سرگرمیوں کی صورت میں واضح ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اس مہینے میں پاکستان کی جانب بلوچ قوم کے خلاف فوجی کارروائیوں اور جبر و استبدادیت میں تیزی اور شدت لائی جاتی ہے اور بلوچ عوام کے خلاف تنگ گھیرا ڈالا جاتا ہے۔تاکہ انہیں احساس دلایا جائے کہ اگر غلامی کو تسلیم نہیں کروگے تو روایتی انداز میں طاقت کے زریعے کچلے جاؤگے،جس طرح قبضہ گیریت کے روز سے لے کر تاحال بلوچ قوم کے خلاف طاقت وتشدد کا مختلف صورتوں میں بے جا استعمال پاکستان کا آزمودہ حربہ رہا ہے۔لیکن یہ بلوچ ہے کہ ظلم کے سامنے جھکتا نہیں ہے،طاقت کے سامنے ڈھیر نہیں ہوتا اور اپنی تاریخ،تہذیب،ثقافت ،روایات اور قومی شناخت و سرزمین کو اپنی جان پر مقدم رکھ کر کٹنے اور مرنے پر ہمیشہ تیار رہتا ہے۔بلوچ کی قربانی کی اس جذبے نے نہ صرف بُزدل دشمن کو تمام تر طاقت وقوت رکھنے کے باوجود صرف فوجی اقدامات پر انحصار کرنے کے بجائے سیاسی چالبازی، پارلیمنٹ،حقوق و ڈویلپمنٹ،صوبائی خودمختاری اور مذہبی کارڈ جیسے چالبازیوں پر مجبور کردیا ہے، بلکہ پاکستان،اس کے مسلح افواج اور گماشتہ عناصر بدترین شکست خوردگی و نفسیاتی مسائل میں گھر کر بوکھلاہٹ و سراسیمگی میں مبتلا ہوگئے ہیں۔

فوجی چھاؤنیوں میں اضافہ اور آرمی کی بھاری نفری کی آمد:

بلوچستان کے مختلف علاقوں ڈیرہ بگٹی نصیرآباد کوہلو نیو کاہان بارکھان مکران جھالاوان رخشان اور آواران میں جارحانہ فوجی کارروائیاں ،نسل کُش اقدامات ،سول آبادیوں پر حملے اور گھروں پر چھاپے،اغواءنُما گرفتاریاں اور مسخ شدہ لاشوں کے پھینکنے کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔جس کے نتیجے میں درجنوں بلوچ فرزندان شہید اور سینکڑوں جبری اغواء کے بعد نامعلوم مقام منتقل کئے جاچکے ہیں۔

جارحانہ عمل میں مزید شدت پیدا کرنے کے لئے ایک خاص منصوبے کے تحت ریگولر آرمی کو کئی اہم علاقوں اور مقامات پر تیزی سے تعینات کیا جارہا ہے جن میں مشکے،آواران،کولواہ،ہوشاب،ہیرونک ،سامی،شاپک سمیت کیچ کے دیگر علاقے شامل ہیں ۔تازہ اطلاعات کے مطابق آواران میں 300 سے زائد فوجی ٹرک،بکتر بند گاڑیاں اور ایمبولینسز پر مشتمل

آرمی کا نیا دستہ پہنچ چکا ہے، جوزلزلے کے بعد ریلیف سرگرمیوں کی آڑ میں پہلے سے قبضہ جمائے بیٹھے آرمی کی بلوچ آبادیوں کے خلاف آئے روز فوجی کارروائیوں کو مزید وسعت دینے اور سخت بنانے کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہیں۔

مشکے آواران ،تیرتیج بزداد، مالار گیشکور، ڈنڈاراور شاپک کے بعد درمیان میں پڑنے والے علاقوں بیدرنگ ،گڈگی کراس، ہیرونک، کلگ ،شاپکول ،گشانگ میں قدوس وخیرجان بزنجواور این پی کی ایماء پراب قابض آرمی اپنی فوجی چھاؤنیاں قائم کرنے کے منصوبے پر گامزن ہے۔جس کے نتیجے میں اسکولوں ،سرکاری ہسپتالوں کے عمارتوں کوفوجی کیمپوں میں تبدیل کرکے جہاں ایک طرف کیچ و آواران کے تمام تر مذکورہ علاقوں میں تعلیمی عمل مکمل رُک گیا ہے ،وہیں دوسری طرف ستم بالائے ستم ہزاروں کی تعداد میں علاقہ مکین کئی عرصے سے آرمی کی محصوری میں رہنے سے تنگ آکر اپنا گھر بار اور زمینیں چھوڑ کر سلسلہ وار حب کراچی اور دیگر علاقوں میں نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں، یہ عمل اب ایک سماجی بحران کا شکل اختیار کرچکا ہے۔

تعلیمی اداروں کی بندش اور مذہبی شدت پسندی کی لہر:

بلوچ قوم کے خلاف تعلیم دشمن عمل اور مذہبی شدت پسندی کا استعمال قومی غلامی کو برقرار رکھنے کے لئے بلوچ قومی قوت کو کمزور کرنے کی سوچ کے مختلف اظہار ہیں۔جس کی ایک طویل پس منظر ہے۔

ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ کہ حاکم محکوم کو آزادانہ ذہنی ماحول میں تمام بنیادی سہولیات مہیا کرکے اس کی سماجی ارتقاء اور ترقی کا بندوبست کرے۔ بلکہ حاکم تو اپنی حاکمیت برقرار رکھنے کے لئے محکوم قوم کے عوام کو غلامی پر آمادہ کرنے کی سب سے پہلی کوشش یہ کرتا ہے کہ جیسے تیسے کرکے انہیں حقیقی تعلیم وتربیت اور علم وشعور سے دُور رکھ کر انہیں ذہنی غلام بنایا جائے۔اس مقصد کے لئے انہیں تعلیم کے نام پر جھوٹے اور خیالی قصہ کہانیوں کے پیچھے لگا کر جی حضوری کی طرف راغب کیا جاتا ہے۔تاکہ وہ حقیقی علوم سے آراستہ ہو کر خود شناسی اور اپنی سماج وقوم سے متعلق اجتماعی سوچ سے مکمل بیگانہ رہ جائیں۔مزید یہ کہ صرف ڈگری یافتہ ہوکر اپنی ذات تک محدود زندگی میں عافیت محسوس کریں۔

مگر لگتا ہے پاکستان کو دیگر قابضین کے برعکس غلام بلوچ قوم کے حوالے اتنے چھوٹے پیمانے پر تعلیم کا حصول تک گوارا نہیں۔تاکہ بلوچ قوم میں پائی جانے والی نفرت کہیں بڑے پیمانے پر شعور کے شعلوں میں نہ ڈھل کر ان کی قبضہ گیریت کی تباہی کا سامان نہ کردے۔اسی لئے کوئٹہ ،خضدار، آواران کے تعلیمی اداروں کو براہِ راست فوجی چھاؤنیوں میں تبدیل کیا گیا۔اب پاکستان نے گماشتہ ٹولہ این پی کی ایماء پر اس حربے میں شدت پیدا کرکے مذہب کے آڑ میں خوف طاری کا ایسا مستقل فیکٹر ٹھونس دیا ہے،جس نے ہر باضمیر انسان کو تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے۔

گوکہ پاکستانی فوج کی جانب مذہبی شدت پسندی کو ایک مضبوط ہتھیار کے طور پر ہمیشہ سے کام میں لایا گیا ہے ۔چاہے وہ طالبان ،حقانی نیٹ ورک، جماعت الدّعوہ،لشکرِطیبہ،جیش محمد کی پراکسی شکل میں ہمسایہ ممالک کے اندرونی معاملات میں بارہا مداخلت اور وہاں بدامنی پھیلانے کی صورت میں ہو،جس کا افغانستان اور ہندوستان متواتر تذکرہ اور پاکستان کو خبردار کرتے رہے ہیں۔یا شیعہ ریاست کی اثر رسوخ کو محدود کرنے اور بلوچ قومی تحریکِ آزادی کو عالمی سطح پر مذہبیت کا جعلی رُوپ دینے لشکرِجھنگوی کی شکل میں شال کے مختلف علاقوں میں ہزارہ نسل کش اقدامات کا ارتکاب کروانا ہو یا بلوچ خواتین کے کردار سے خوفزدہ ہوکر ان کے چہروں پر تیزاب پاشی کرنی ہو یا پھر بلوچ آزادی پسند حلقوں ،اہلِ فکرو دانش ،سیاستدانوں اور سیاسی کارکنوں کی شہادتوں کو مذہبی جواز فراہم کرنے کے لئے مذہبی ناموں کا سہارالینا ہو،جن میں انصارالاسلام،سپاہ شہداء اور حدود اللہ وغیرہ شامل ہیں۔ان تمام مذہبی حربوں کا مقصد بلوچ سیکولر سماج مین مذہبی جنونیت کے زریعے پاکستان کے نو آبادیاتی نظام کو برقرار رکھنے کی کوشش ہے۔

اس مذہبی کارڈ کو استعمال کرنے کا ایک نیا طریقہ رواں سال اپریل کے مہینے میں اس وقت سامنے آیا جب الفرقان نامی گمنام مذہبی شدت پسند تنظیم کے نام پر پنجگور میں طالبات کو تعلیمی عمل سے دور رہنے کی بذریعہ پمفلٹ دھمکی دی گئی۔اسی دوران پنجگور میں پرائیویٹ اسکول ایسوسی ایشن کے ایک ذمہ دار کو تشدد کا نشانہ بنا کر طالبات و اساتذہ کو ہراساں کرنے کی کوشش بھی کی گئی اور علاقے کے عوام میں خوف وحراس کا ماحول پیدا کرنے کے لئے مسلسل پُرتشدد حربوں کا استعمال کیا گیا۔اسی اگست کے مہینے میں ایک مرتبہ پھر آئی ایس آئی کی جانب اس کاغذی نام کا استعمال کیا گیا،جب ایک The Oasis نامی پرائیویٹ اسکول کو تعلیمی ریکارڈ سمیت نذرِآتش کیا گیا اور ایک اسکول وین پر فائرنگ کی گئی۔اگرچہ ڈاکٹر مالک کی جانب اس معاملے میں آخری بار جھوٹی تشویش کا اظہار کیا گیا لیکن حقیقت میں وہ خود اوران کی جماعت کے بعض

مکّار عناصر آئی ایس آئی اور فوج کی اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔دوسری طرف آواران وکیچ کے علاقوں میں تعلیمی اداروں کو چھاؤنی میں بدلنے اور بے یقینی و عدم تحفظ کے سبب گرمیوں کے تعطیلات گزرنے کے باوجود تعلیمی عمل شروع نہیں ہو سکا ہے ۔اس ساری صورتحال نے بلوچ قوم کے باشعور اور سنجیدہ حلقوں کو مجموعی طور پر کرب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

تو لہٰذا تعلیمی عمل کی بحالی اور مذہبی شدت پسندی کے حربے کو ناکام بنانے کے لئے آگاہی مہم کو تیز کرنا ہوگا اور اپنی قومی ذمہ داریوں کا احساس کر کے لوگوں کو اس حوالے منظّم بنیادوں پر ایک تحریک کی صورت میں کردار نبھانے پر آمادہ کرنا ہوگا۔تاکہ شدت پسندی کی اس عفریت سے اپنے آنے والی نسلوں کو محفوظ بنانے اور تعلیمی زیور سے آراستہ کرنے کی راہ ہموار کی جاسکے۔

ذکری نمازی تفریق کی سازش:

بلوچ قومی یکجہتی و یکسوئی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے مذہبی شدت پسندی کا استعمال دشمن پاکستان کی جانب ایک گہری سازش ہے۔جس کی ایک کڑی ذکری نمازی کی مذہبی بنیاد پر بلوچ قوم کو تقسیم کرنے کی کوشش ہے۔اگرچہ بلوچ معاشرہ ہمیشہ سے مذہبی رواداری کا پاسدار اور سیکولر خیالات کا حامل رہا ہے اور تمام مذاہب کے پیروکاروں کو اپنے اپنے عقائد کے مطابق ہمیشہ مذہبی آزادی حاصل رہی ہے،قابض پاکستان نے بلوچ قومی تحریک آزادی کی کامیابی و مضبوطی اور اسے رنگ نسل زبان علاقائیت قبائلیت غرض ہر قسم کی تفریق سے بالاتر خالص نیشنلزم کی بنیاد پر استوار ہوتا دیکھ کر دیگر تمام قسم کی منافقانہ وجارحانہ کارروائیوں کے ساتھ ساتھ مذہبی شدت پسندی سے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔تعلیمی اداروں پر سلسلہ وار حملے،خواتین کے چہروں پر تیزاب پاشی اور سیاسی کارکنوں و دانشوروں کو مذہبی ناموں سے قتل کرنے کے بعد اب بلوچ قوم کو آپس میں دست و گریبان کرنے کے لئے معصوم بلوچوں پر ذکری نمازی کی مصنوعی تفریق کی بنیاد پر یکے بعد دیگرے جان لیوا حملے کئے جارہے ہیں۔جس کے لئے بلوچستان کے طول و عرج میں لمبے عرصے سے آئی ایس آئی و جمیعت کے زیرِ اثر چلنے والے 'مدرسوں' میں دینی علوم کے مقدس نام پر 'طالبانائزیشن' کو فروغ دینے کا بندوبست ہوتا رہا ہے۔اس مدّ میں تحریک طالبان پاکستان کے ایک اہم رہنما عمر خراسانی نے گذشتہ دنوں خود ہی انکشاف کیا تھا کہ مکران میں ان کے کارندے اور جنگجو موجود ہیں اور بلوچ آزادی پسندوں سے برسرِ پیکار ہیں۔یہ انکشاف اس بات کی دلیل ہے کہ آئی ایس آئی طالبان کے ذریعے خیبر پختونخواہ اور افغانستان کے بعد بلوچستان میں اپنی مفادات کی خاطر اور بلوچ جہدِ آزادی کو کاؤنٹر کرنے کے لئے اس عمل کو وسعت دیئے ہوئے ہیں۔حالیہ کارروائیاں رمضان کے آخری دنوں میں کیچ کوہِ مراد سے واپسی پر نال خضدار کے مقام پر ذکری بلوچ زائرین کے بس پر بم حملے اور متعدد معصوم بلوچوں کے زخمی ہونے کے بعد آواران کے علاقہ کہن زیلگ میں ذگرانہ (عبادت گاہ) پر آئی ایس آئی کے لے پالک ڈیتھ اسکواڈ کے حملے میں شہید رضا جہانگیر کے والد واجہ بختیار بلوچ ،حاجی اُمیتان بلوچ،سعید اللہ ولد دلمراد،مزار بلوچ ولد سید محمد،نیاز ولد بنگل بلوچ،داد جان ولد میر دوست اور اللہ بخش ولد عثمان بلوچ شہید ہوگئے۔ساتھ ہی پیر بخش ولد بجار،نور جان ولد ہارون،پلین ولد شاہ دوست،ہاشم ولد مزار،دوشمبے ولد کریم داد،بدل ولد سعید محمد،اور غلام محمد زخمی ہوگئے۔اس سے پہلے کیچ کے علاقہ جمک گورکوپ کے علاقے میں آئی ایس آئی کے مذہبی ونگ نے روڑ بلاک کر کے سری کلگ اور سولانی سے تربت آنے والے گاڑیوں کو روک کر ایک گاڑی میں سوار 3 افراد کو ذکری بلوچ ہونے کی بنیاد پر گاڑی سمیت اغواء کیا اور باقی گاڑیوں کے سواریوں سے نقدی و موبائل چھین کر تین گاڑیوں کو نذرِ آتش بھی کیا گیا۔تربت شہر سے شاپک کے رہائشی دکاندار نصیر بلوچ ولد پیر بخش کو ذکری ہونے کی بنیاد پر اغواء کیا گیا۔قومی چیلنجز کو مدنظر رکھ کر وقت و حالات کا تقاضا ہے کہ تمام بلوچ سیاسی تنظیمیں فروعی اختلافات سے بالاتر ہو کر اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کر کے باہمی اشتراک عمل اور مضبوط کوآرڈینیشن سے مذہبی شدت پسندی جیسی سازشوں کو ناکام بنائیں۔

ڈاکٹر مالک کی بھڑک بازیاں اور دورہ چین:

آئی ایس آئی کے ٹکڑوں پر پلنے والی پارلیمانی ٹولہ این پی اور کھٹ پتلی وزیراعلیٰ ڈاکٹر مالک بی این پی واختر مینگل سے دو قدم آگے نکل کر پاکستانی ملٹری اسٹیبلشمنٹ اور جی ایچ کیو کو اپنی وفاداریاں اور بہتر خدمات فراہم کرنے کی یقین دہانیوں سے اقتدار پر براجمان ہونے کے بعد اپنے قول و فعل دونوں کے زریعے بلوچ دشمنی کی صورت میں اپنے وعدے وفا کر رہے ہیں۔22 اگست کو تربت میں مولا بخش دشتی کی برسی کے موقعے پر ڈاکٹر مالک آئی ایس آئی کا اہم مہرہ حاصل بزنجو اور این پی کے دیگر پاکستانی گماشتوں نے ایک بار پھر آزادی پسند بلوچ عوام اور قومی تنظیموں کے خلاف جملہ بھڑک بازی کی۔اپنی

آقا کی خوشنودی کے لئے حقیقی بلوچ قوتوں کے بارے میں اس قسم کی بیہودہ لفاظیت اور غیر اخلاقی زبان کا استعمال انہیں ان کے پیش روؤں کی طرح ایک نہ ایک دن ضرور احتساب سے دوچار کرے گی۔ جو ان کی سیاسی یتیمی کی صورت میں ابھی سے واضح ہوتا رہا ہے، جس طرح غوث بخش بزنجو عوامی حمایت کھو بیٹھ کر سیاسی تنہائی کا شکار ہوا تھا۔

زرائع کے مطابق مری معاہدے کے تحت ڈاکٹر مالک کو پانچ سال کے بجائے ڈھائی سال کے لئے وزارتِ اعلیٰ کا منصب سونپ دیا گیا ہے اور باقی مدت نواز لیگ کے نمائندے کو سونپ دی جائے گی۔ اگر پاکستان میں سر اٹھانے والے سیاسی بحران کے باوجود نواز شریف کی حکومت برقرار رہ جاتی ہے تو اس مدت کے دوران ڈاکٹر مالک سے ہر ممکن حد تک کام لینے کی کوشش کی جائے گی، جو معاہدے کی پاسداری قرار پائے گی۔ اس دورانیے میں ڈاکٹر مالک اور ان کی جماعت کو بلوچ دشمنی کی صورت میں عظیم تر خدمات کے بدلے کرپشن کرنے کی چھوٹ دی گئی ہے، تاکہ وہ عیش وعیاشیوں اور دولت و پیسے کے نشے میں ہر قسم کی بلوچ دشمنی کے لئے وقف ہو۔

اگست کے آخری عشرے میں پنجابی وزیراعلیٰ شہباز شریف اور پاکستانی وفاقی وزیر احسن اقبال کے ہمراہ ڈاکٹر مالک بھی چین کے دورے پر چلے گئے، جہاں انہوں نے پاکستان چین جوائنٹ کوآرڈینیشن کمیٹی کے تیسرے اجلاس میں شرکت کی، اور خنجراب گوادر موٹروے کی تعمیر اور چین کی پاکستان اور بالخصوص بلوچستان میں وسیع تر اقتصادی دلچسپی کی مدّ میں جاری منصوبوں اور اکنامک کوریڈور کے پلان کے حوالے بریفنگ دی گئی۔ ڈاکٹر مالک نے اس موقع پر زمینی حقائق کے برعکس من گھڑت لفاظیت کے زریعے جھوٹ کا سہارا لے کر چینی حکام کو یقین دہانی کرانے کی کوشش کی کہ بلوچستان میں سرمایہ کاری کے لئے حالات سازگار ہیں اور خطہ پُرامن ہے۔ لیکن اس حقیقت سے نظریں چُرانا ممکن نہیں کہ بلوچستان میں بلوچ قومی تحریکِ آزادی کی بدولت حالات جنگی رُخ اختیار کر چکے ہیں، جہاں نہ صرف پُرامن طریقے سے سرمایہ کاری ممکن نہیں بلکہ جاری استحصالی منصوبوں کو بھی مزاحمت اور ناکامی کا سامنا ہے۔ جس کی واضح مثال گوادر پورٹ کی اب تک غیر فعالی ہے۔ لیکن ڈاکٹر مالک پاکستان سے نمک حلالی میں کبھی چین کے دورے پر اس قسم کی ڈھینگیں مارتے ہیں تو کبھی کوئٹہ ایف سی ہیڈ کوارٹر میں جھوٹی تسلیوں کے ذریعے تاخیری حربوں کا سہارا لینے سے اپنی اقتدار کی کرُسی کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ڈاکٹر مالک، حاصل بزنجو اور اختر مینگل کی حیثیت تو سیاسی یتیموں کی ہے، جنہیں بلوچ عوام نے عام انتخابات میں دھتکار کر مسترد کیا تھا۔ مگر چونکہ انہیں پاکستانی ملٹری اسٹیبلشمنٹ کی خوشنودی حاصل ہے اسی لئے وہ اپنی اقتدار اور دولت کی حوس کی خاطر نوآبادیاتی و عالمی سامراجی منصوبوں کی بلوچستان میں تکمیل کے لئے اپنی قول وفعل سے بلوچ دشمنی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ غور کرنے اور سمجھنے کا مقام ہے کہ بلوچ قوم کی مرضی و منشاء کے بغیر چین و دیگر عالمی قوتوں کی بلوچستان میں سرمایہ کاری اور استحصالی منصوبوں کا ڈوبنا یقینی امر ہے۔ جس کے لئے ڈاکٹر مالک اور ان کے سامراجی آقا چاہے کتنی ہی اُچھل کود کریں۔ کیونکہ عوامی طاقت ہی وہ اصل قوت ہے جو کسی بھی عمل کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کرتی ہے اور بلوچ قوم خطے کے ایک اہم اسٹیک ہولڈر ہونے کے ناطے یہ حق اور طاقت رکھتی ہے کہ ان کی مرضی کے بغیر اغیار کے استحصالی خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتے۔

11 اگست یومِ آزادی اور 14 اگست یومِ سیاہ:

حسبِ سابق اس مرتبہ بھی 11 اگست یومِ آزادی بلوچستان اور 14 اگست غیر فطری مملکت پاکستان کی معرضِ وجود میں آنے کے روز کی مناسبت سے نفرت میں یومِ سیاہ منایا گیا۔ 11 اگست کو مختلف سیاسی تنظیموں کی جانب بلوچ قومی آزادی کی مناسبت سے آگاہی پروگرامز اور سیمینارز کا اہتمام کیا گیا۔ جبکہ بلوچ نیشنل فرنٹ کی کال پر 14 اگست کو بلوچستان بھر میں پہیہ جام اور شٹر ڈاؤن ہڑتال کیا گیا۔

قابض پاکستان اور مقبوضہ ریاست بلوچستان کے بیچ اسی قبضہ گیریت کی بنیادی نکتے پر تضاد حائل ہونے کی وجہ سے گذشتہ 67 سالوں سے ایک جنگ چِڑی ہوئی ہے۔ کیونکہ پاکستان نے 11 اگست یومِ آزادی بلوچستان کو خاطر میں نہ لاکر بندوق و طاقت کے ذریعے اسے جبری طور پر اپنے ساتھ ملایا تھا اور بلوچ اسی قبضے کے خاتمے اور بلوچ سرزمین کی آزادی کی بحالی کے لئے دفاعی سیاسی عمل پر روز اوّل سے کاربند ہے اور یہ تضاد اب انتہائی شدّت اختیار کر چکی ہے۔ ایک طرف بلوچ اپنی محدود وسائل کے ساتھ دشمن قوتوں سے برسر پیکار ہے۔ دوسری جانب پاکستان اپنے کرایہ کے سپاہیوں اور گماشتہ مذہبی و غیر مذہبی پارلیمانی عناصر و داشتہ مہروں کے ذریعے قومی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے بلوچ نسل کشی پر اُتر آیا ہے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ نیشنلزم کے جذبے کے تحت قربانی کے جذبے سے سرشار جن قوموں نے بہادری سے طاقتور دشمنوں سے اپنا دفاع کیا وہ ایک نہ ایک دن ضرور

سرخرو ہوئے ،اور بلوچ قوم بھی اسی تاریخی حقیقت پر گذشتہ کئی دہائیوں سے کاربندرہ کر پاکستان سے اپنا بنیادی حق آزادی چھیننے کی کوششوں میں مصروفِ عمل ہے۔بلوچ عوام ایک نہ ایک دن ضرور فتح یاب ہوکر بلوچ وطن کی آزاد فضاؤں میں سانس لیں گے۔

بلوچ نیشنل فرنٹ دشت مرکزی جلسہ عام:

بی ایس او آزاد کے شہید رہنما کامریڈ رضا جہانگیر امداد بحیر اور شہدائے اگست کی یاد میں بی این ایف کے زیرِ اہتمام کیچ کے علاقے دشت میں عظیم الشان جلسہ عام کا انعقاد کیا گیا۔مرکزی سیکریٹری ڈاکٹر منان،ڈپٹی سیکریٹری کمال بلوچ کے علاوہ اعزازی مہمان لطیف جوہر و دیگر مقررین نے ہزاروں کی تعداد میں موجود عوامی اجتماع سے خطاب کیا۔جن کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق پندرہ ہزار کے لگ بھگ تھی ۔مقررین نے اپنے خیالات کا اظہار کرکے موجودہ سیاسی صورتحال اور قومی مسائل پر نظر دوڑانے کے ساتھ ساتھ شہدائے اگست اور تمام بلوچ شہداء کو خراجِ عقیدت پیش کیا،جنہوں نے قومی آزادی کی راہ میں اپنی جانوں کی قربانیاں دی ہیں۔

اس قسم کے عوامی اجتماعات سے آزادی کے حصول کی جدوجہد میں جہاں قومی اجتماعی سوچ کے اظہار کے تحت دشمن قوتوں پر سیاسی صفوں میں عوامی طاقت واضح ہو جاتی ہے ،وہیں سیاسی موبلائزیشن ،Mass Awareness کے ساتھ عوام میں جدوجہد کے حوالے ایک نیا حوصلہ جنم لیتا ہے۔کیونکہ عوام اپنی سیاسی رہنماؤں کو اپنے ساتھ گھل مل کر قربانی دیتا دیکھ کر ان میں قومی راہ نجات کے فکر پر آمادگی کے ساتھ عملی میدان میں نیشنلزم کے جذبے پر مبنی جوش ولولہ پیدا ہوتا ہے۔تب وہ اپنی ذات اور محدود زندگی سے نکلنے کا حوصلہ پاکر انفرادیت سے اجتماعیت کی جانب محوسفر ہوتے ہیں اور قومی تنظیموں و سیاسی اداروں کے سسٹمیٹک جمہوری جدوجہد سے جڑ کر منظّم انداز میں پُرانے کامریڈوں سے شریک جدوجہد ہو جاتے ہیں ۔ہمدردی سے عملی راستے تک کا یہ سفر گھر یا کمپیوٹر پر بیٹھ کر جمائیاں لینے یا سطحی خواہشات کا اظہار کرنے سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ اس کے لئے عوام کے درمیان مسلسل موجودگی، سیاسی تعلیم و تربیت کی فراہمی اور انہیں اپنی بنیادی قومی حقوق و ملکیت کا احساس دلاکر اور ان میں سیاسی وفکری جذبات اُبھارنے سے ہی انہیں شریک جدوجہد کیا جا سکتا ہے۔

بلوچستان میں صحافت شجرممنوعہ:

اگست کے اواخر میں ممتاز صحافی دی آن لائن نیوز کے بیورو چیف اور بلوچستان یونین آف جرنلسٹس کے جنرل سیکریٹری ارشاد مستوئی ،رپورٹر عبدالرسول اور اکاؤنٹنٹ محمد یونس کو پاکستانی خفیہ اداروں کے کارندوں نے ان کے دفتر کے اندر گھس کر فائرنگ کرکے قتل کر دیا۔بلوچستان میں پاکستانی خفیہ اداروں کی جانب میڈیا ہاؤسز اور صحافیوں کو ایک سازش کے تحت ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے راستے سے ہٹانے کا سلسلہ طویل عرصے سے جاری ہے تاکہ بلوچ و بلوچستان سے متعلق ہر اس آواز کو دبایا جا سکے جو ذرا بھی حقیقت پسندی اور دیانتدارانہ صحافت کا آئینہ دار ہو۔اس سے پہلے بھی شال، کراچی، خضدار، گوادر حب و دیگر علاقوں میں میڈیا ہاؤسز کو بند کرنے کے ساتھ ساتھ متعدد صحافیوں کو ہدف بنا کر قتل کیا جا چکا ہے۔جن میں حاجی عبدالرزاق، رزاق گل، لالا حمید، صدیق عیدو، جاوید نصیر رند، الیاس نذر، عبدالحق بلوچ و دیگر شامل ہیں۔صحافی کسی بھی معاشرے کی آواز ہوتے ہیں اور بلوچستان میں صحافت کو شجر ممنوعہ بنا کر پاکستان بلوچ قوم کے خلاف اپنی کرتوتوں کو چھپا کر جاری رکھنے کی غیر انسانی پالیسیوں پر گامزن ہے۔چونکہ پاکستان اپنی کنٹرولڈ میڈیا اور گماشتہ صحافیوں کے ذریعے جھوٹ بولنے،منفی پروپگینڈہ کرنے اور حقائق کو بلیک آؤٹ کرنے کی مسلسل کوششوں میں ناکام ہوا تو انہوں نے حقیقت پسند اور باضمیر اُن صحافیوں کو ٹارگٹ کرنا شروع کیا جو معروضی حالات، زمینی حقائق اور مظلوم اقوام وطبقات پر جاری پاکستان کی جنگی جرائم کو ہائی لائٹ کرنے کی صحافتی جنگ لڑ رہے تھے۔مگر اس خام خیالی میں رہنا قطعی طور پر محال ہے کہ سچائی کا گلا گھونٹنے سے سچ ہمیشہ کے لئے مِٹ جائے گی۔کیونکہ نہ حقیقت چھپانے سے کبھی چھپ سکتی ہے اور نہ سچائی کا بول بالا کرنے والے پیکر ختم ہو سکتے ہیں۔بلکہ سچے لوگوں کی بدولت سچ اور سچائی ہمیشہ زندہ وسلامت رہتی ہے۔

پاکستان کا موجودہ سیاسی بحران:

14 اگست سے پنجاب و اسلام آباد میں سر اُٹھانے والے حالیہ سیاسی بحران آئندہ دِنوں کیا رُخ اختیار کرتا ہے،اس پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی مقتدرہ،سیاسی جماعتوں اور فوج میں کئی داخلی اور خارجی معاملات پر سوچ کی یکسانیت نہیں پائی جاتی اور اقتدار و اختیار کے لئے ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنا اور دباؤ دینا ان کا شیوہ رہا ہے۔افغانستان، بھارت، بلوچستان، فاٹا و طالبان سمیت خطے میں اہم سیاسی و تزویراتی تبدیلیوں اور بدلتے ہوئے حالات و دلچسپیوں سے متعلق پاکستانی

فوج اور مقتدرہ ایک صفحے پر نہیں ہیں اور ان میں آپس میں کئی اہم ایشوز پر اختلافات موجود ہیں۔ یہ اختلافات افغانستان سے نیٹو فورسز کے انخلاء، حالیہ صدارتی انتخابات کے بعد حکومت میں تبدیلی اور بھارت میں بی جے پی اور وزیراعظم نریندر امودی کی برسراقتدار آنے کے بعد مزید گہرے ہوگئے ہیں۔ زرائع کے مطابق حامد میر کے معاملے اور جنرل (ر) پرویز مشرف کے خلاف عدالتی کارروائی نے فوج کو برہم کیا اور بھارتی وزیراعظم نریندر امودی کی تقریب حلف برداری میں نواز شریف کی شرکت فوج کو بے حد ناگوار گزری ہے۔ کیونکہ بی جے پی میں خاص کر نریندر مودی جو پاکستان دشمنی میں شہرت رکھتا تھا، ہمیشہ سے اپنی تحریر و تقریر اور سیاسی تاریخ میں پاکستان اور ان کی فوج کے خلاف زہر اُگلتا تھا۔ لیکن نواز شریف اپنی سرمایہ داران بزنس کے دروازے کھولنے کے لئے مودی کے دربار میں حاضری دے کر اسے دوطرفہ امن کی کوششوں کی ایک کڑی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ پاکستان دشمنی کی ریکارڈ رکھنے والے وزیراعظم مودی نے انہی کی موجودگی میں اپنی مذکورہ تقریب حلف برداری میں کابینہ کے ایسے ارکان کا انتخاب کیا جنہوں نے جلد ہی پاکستان کو دھمکی آمیز لب و لہجے سے مخاطب کر کے بارڈر پر انڈین آرمی کی اضافی نفری تعینات کردی اور دوسری طرف لائن آف کنٹرول پر روز پاکستانی و بھارتی افواج کے درمیان جنگ بندی معاہدے کے باوجود ایک دوسرے پر حملوں کا نہ تھمنے والا سلسلہ جاری ہے۔ جس سے پاکستانی ہٹ دھرم و سرکش فوج میں کافی بے چینی پائی جاتی ہے۔ افغانستان کے وزیر داخلہ جنہوں نے گذشتہ دنوں اپنے تفصیلی بیان میں ایک بار پھر پاکستان کو طالبان، حقانی نیٹ ورک سمیت درجنوں مذہبی پر اکسی تنظیموں کی پشت پناہی کا الزام لگا کر اپنے ملک میں گڑبڑ پھیلانے کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہرایا اور سرحد پر منہ توڑ جواب دینے کا عندیہ دیتے ہوئے خبردار کیا کہ افغانستان میں مداخلت سے گریز کیا جائے۔ افغانستان جس نے آج تک پاکستان کو ایک ریاست کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا ہے اور بھارتی افواج بھی افغان نیشنل آرمی کو تربیت دینے اور ترقیاتی منصوبوں میں حصہ لینے کی سرگرمیوں کی وجہ سے افغانستان میں اپنا مضبوط اثر رسوخ رکھتی ہے۔ اس صورت میں نواز شریف کی سرمایہ دار حکومت اپنی بزنس اور اقتدار کے لئے اس حد تک جارحانہ پالیسی اختیار نہیں کر پا رہا ہے جو فوج چاہتی ہے۔ اسی لئے بدلتی ہوئی علاقائی حالات کے ساتھ فوج ایک بار پھر اپنے مہروں کے ذریعے براہ راست طاقت و اختیار کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی پَرتول رہی ہے۔ عمران خان جو ہمیشہ سے ملٹری اسٹیبلشمنٹ اور طالبان کے حامی رہے ہیں اور طالبان جنہیں پاکستانی فوج نے تخلیق کر کے ان کے خلاف ڈھونگ آپریشن کے نام پر امریکہ سمیت عالمی دنیا سے دھوکہ دہی کے تحت بڑے پیمانے پر عسکری و معاشی مدد و کُمک حاصل کی ہے، جبکہ پسِ پردہ انہیں ہمسایہ ممالک کے خلاف اور عالمی امن و امان کو تہہ و بالا کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ اب ان مذہبی شدت پسند گروہوں کو شدت سے مخالفین کے خلاف استعمال کرنے کی غرض سے ایک بار پھر باقاعدہ طور پر اپنے ہاتھوں میں لینے کے لئے فوج نے طاہرالقادری اور عمران خان جیسے کھلاڑیوں کو میدان میں اُتار دیا ہے۔ اس صورتحال میں نواز شریف کی حکومت سرینڈر کر کے اختیارات سے دستبردار ہو جائے یا پوری قیادت تبدیل ہو کر فوج کے مہرے یا خود فوج اقتدار سنبھال لے، مگر فوج نے ہر صورت معاملات کو اپنے ہاتھوں لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تادمِ تحریر نواز شریف نے فوج کے سربراہ سے ملاقات میں اپنی حکومت برقرار رکھنے کی کوشش میں دفاع و خارجہ امور حکومت سے فوج منتقلی کی خفیہ ڈیل کر کے انہیں بحران کو ختم کرنے کی درخواست کی ہے، جس سے سیکیورٹی اسٹیٹ پاکستان میں فوج کی سب سے طاقتور ادارے کی حیثیت مزید کھل کر سامنے آگئی ہے، اب آگے چل کر پاکستان کی اس سیاسی بحران کی اونٹ کس کروٹ بیٹھتی ہے، اس کے لئے ذرا انتظار کرنا ہوگا اور شاید زیرِ نظر سطور کے پڑھنے تک فیصلہ ہو چکا ہوگا۔

بلوچ سیاسی ہلچل پر پاکستانی میڈیا میں پروپگینڈہ:

گذشتہ چند عرصے سے حیربیار مری اور ان کی مسلح تنظیم کے دوستوں کی جانب سوشل میڈیا اور توار اخبار میں مختلف آزادی پسند سیاسی پارٹیوں اور تنظیمی اکائیوں کیخلاف کھولے گئے یکطرفہ محاذ اور پروپگینڈے سے بلوچ سیاسی حلقوں اور عوام میں خوامخواہ کی بے چینی اور ابہام کی صورتحال پیدا ہونے کے بعد دشمن پاکستان نے اس موقع کو غنیمت جان کر اپنی پروپگینڈہ ٹول یعنی زرائع ابلاغ کو متحرک کیا ہے۔ بی ایس او آزاد شروع دن سے اس خدشے کا اظہار کرتا رہا ہے کہ ''سوشل میڈیا پر اس طرح سے حساس سیاسی معاملات کو اُچھالنے اور قومی و تنظیمی اہم رازوں کے افشاں کرنے سے قومی اتحاد و اتفاق اور سیاسی اختلافات کا حل تو ممکن نہیں، جس طرح مختصر سی مدّت میں اس رویے سے آپس میں دُوریاں مزید بڑھ گئی ہیں تاہم اس عمل سے پاکستان اور اس کے بلوچ دشمن ادارے فائدہ اُٹھانے کی

بھرپور کوشش کر رہے ہیں‘‘۔

26اگست روزنامہ اُمت کا رپورٹ پڑھنے کے بعد ایک ذی شعور انسان بخوبی یہ ادراک کر پاتا ہے کہ بی ایس او آزاد سمیت جن قومی تنظیموں و پارٹیوں نے اس حوالے اپنے خدشات کا اظہار کیا تھا وہ بالآخر سچ ثابت ہوگئے ہیں۔مگر حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ اب بھی یہ گروہ اپنے کئے سے باز نہیں آرہا اور اپنی تنظیمی ضد اا ور انا اور دیگر پسِ پردہ دیگر عزائم کی بنیاد پر حقیقی سیاسی رہنماؤں کو مخبری تک کے القابات دینے سمیت متحرک سیاسی کارکنوں کے نام، ولدیت اور رہنے کے مقامات تک کی نشاندہی کر رہے ہیں۔جس سے دشمن نے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔مذکورہ اخبار کے رپورٹ کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان ہمارے دوست نُما دشمنوں کی ان غیر ذمہ دارانہ اور بچکانہ رویوں کا کس حد تک فائدہ اُٹھا رہا ہے۔انہی کی بدولت سوشل میڈیا پر دستیاب معلومات کو پاکستان اپنی ریکارڈ اور معلومات کا حصہ بنا رہی ہے اور پھر اس معلومات کے تحت سیاسی دوستوں و ہمدردوں کو نقصان پہنچا کر چالاکی سے اس کی ذمہ داری آزادی کے محاذ پر سرگرم تنظیموں کے ایک دوسرے کے سر ڈال رہی ہے۔جس کی بنیاد پر وہ خود کو کسی بھی طور پر بری الذمہ کرنے کی تگ و دو کر رہی ہے۔اس ضمن میں پاکستان ڈیڑھ ہزار سے زائد لاشیں پھینکنے اور ہزاروں محبِ وطن بلوچ عوام کو قتل کرنے کے بعد بھی ان جرائم کو آزادی پسند تنظیموں کی آپسی چپقلش اور ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونے کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔اُمت اخبار اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے ’’نواب مری کی وفات کے بعد بلوچستان کی علیحدگی پسند تنظیمیں ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوگئی ہیں۔اس باہمی چپقلش نے ان کے کارکنوں کو بد دل کرنا شروع کر دیا ہے۔مکران تربت و دیگر علاقوں میں دہشت گردوں (آزادی پسند جہدکاروں) کا ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل معمول بن گئی ہے۔متحارب تنظیمیں ایک دوسرے کے کارکنوں اور عام بلوچوں کو ایجنٹ قرار دے کر قتل کر رہے ہیں وغیرہ‘‘۔غور کیجئے ،مذکورہ اخبار نے اکثر و بیشتر ان باتوں کو بنیاد بنا کر پروپگینڈہ کرنے کی کوشش کی ہے جو اسلم، سلام، جانان، نودبندگ اور رئیسانی وغیرہ اپنی نام نہاد تنقید نما کردار کُش پروپگینڈے میں آزادی پسند سیاسی و عسکری تنظیموں کو سوشل میڈیا میں شب و روز ہدف بناتے رہتے ہیں۔

مثلاً حیربیار کے دوستوں کی جانب نواب مری کو متضاد بنانا، بی ایل ایف اور بی آر اے پر عام لوگوں کے قتل کا بے جا الزام عائد کرنا، بی ایس او آزاد، بی این ایم جیسی سیاسی اداروں سے عوام اور کارکنوں کو بددل کرنے کی کوششیں کرنا مندرجہ بالا پروپگینڈے کو بنیاد فراہم کر رہے ہیں۔

جس طرح بی ایل اے سے وابستہ نادان لیکن نامی گرامی و بظاہر ذمہ دار دوستوں نے شال سے اغواء چیئرمین زاہد بلوچ کی ایف سی اور آئی ایس آئی اہلکاروں کے ہاتھوں اغواء کے ثبوت موجود ہونے کے باوجود اپنی تنظیمی انا اور سیاسی اختلافات کی بنیاد پر بدنیتی میں بی ایس او آزاد کے سرکردہ لیڈرشپ بانک کریمہ بلوچ، کمال بلوچ اور دیگر کو اس واقعے کا ذمہ دار ٹھہرانے کی ناکام کوشش کی اور پھر زاہد بلوچ کے بھائی کے ذریعے اخبارات میں بیان جاری کروا کے زاہد بلوچ کے اغواء میں مذکورہ لیڈران پر شک کا اظہار کیا گیا۔اس غیر سیاسی و غیر ذمہ دارانہ موقف سے فائدہ اُٹھا کر کل کو پاکستان ان بیانات کو آن دی ریکارڈ اپنے ساتھ لے کر ثبوت کے طور پر انسانی حقوق کے کسی بھی عالمی ادارے یا مہذب اقوام کے سامنے پیش کر کے اس طرح کے ہزاروں کیسز کو آزادی پسندوں کے آپسی چپقلش اور گہرے اختلافات و دشمنی کا نتیجہ باور کرانے کی کوشش کر سکتا ہے، جس سے بلوچ قوم اور تحریکِ آزادی کو بے پناہ نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے۔

اسی لئے بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد نے بڑے تحمل اور طویل سوچ و بچار کے بعد سینٹرل کمیٹی کے توسط سے فیصلہ کیا ہے کہ فکرِ آزادی و سیاسی تنقید کے نام پر تنظیم کی ساکھ، سیاسی سرگرمیوں اور اداروں کو متضاد پیش کرنے اور لیڈرشپ و کارکنوں کی کردارکشی، ان کی نشاندہی اور بدنام کرنے کی کوششیں کرنے والوں کے عزائم کو عوامی سطح پر بے نقاب کیا جائے گا۔تاکہ بی ایس او آزاد میں درآمد شدہ مسائل کی بنیاد پر خود ساختہ بحران کا تاثر چھوڑنے والے عناصر کے گروہی مفاداتی سوچ سے تنظیم میں ہر قسم کی تقسیم و انتشار کی سازشوں کو ناکام بنایا جا سکے۔

﴿ختم شد﴾

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆